اردو کی آخری کتاب

ابن انشا

اردو کی آخری کتاب

نجمی کے ۱۰۱ کارٹونوں کے ساتھ

آتا ہے یاد مجھ کو

گزرا ہوا زمانہ



نامنظور کردہ چیئرمین ٹیکسٹ بک بورڈ
بروئے مراسلہ نمبر ۳۲۷ پی۔ ایس ۷۱۔ مورخہ ۱۸ر جنوری ۱۹۷۱ء

اردو کی آخری کتاب

(باتصویر)

مؤلفہ

ابنِ انشا

شائع کردہ بصرفِ زرِ کثیر

لاہور اکیڈمی

چوک اردو بازار لاہور

فون نمبر: ۶۳۲۲۸

طبع اوّل ———— جولائی ۱۹۷۱ء

طبع دوم ———— جولائی ۱۹۷۲ء

طبع سوم ———— ستمبر ۱۹۷۴ء

طبع چہارم ———— مارچ ۱۹۷۵ء

طبع پنجم ———— نومبر ۱۹۷۷ء

طبع ششم ———— مارچ ۱۹۷۸ء

طبع ہفتم ———— مئی ۱۹۷۹

طبع ہشتم ———— مارچ ۱۹۸۰ء

قیمت :- ۱۵ روپے

ناشر : سردار محمود چودھری

مطبع :- پنجاب پرنٹنگ پریس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Telephones:
PBX - 62281/62282
Chairman 54715

WEST PAKISTAN TEXT - BOOK BOARD

Head Office:
66. NEW GULBERG ROAD, LAHORE.

CHAIRMAN

No. ۳۳ی۔بی ایس۔۷۱

Date ۱۸ جنوری ۱۹۷۱ 19

حوالہ چٹھی مورخہ ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۷۱

محترمی

تسلیم۔

آپ کی مجوزہ اردو ایڈیشن پر بڑا غور و خوض کیا گیا۔ ہماری رائے میں یہ طلبا کو نصابی درسی کتب سے بے نیاز کرنے کی ایک خطرناک کوشش ہے۔

خدشہ ہے کہ اسے پڑھ کر استاد طالب علم اور طالب علم استاد بن جائیں گے۔

لہٰذا ٹیکسٹ بک بورڈ اسے نامنظور کرنے میں معذرت کا اظہار کرتا ہے۔

نیاز مند

ابن انشا صاحب

سید نسیم محمود چیئرمین

انشاییے انشاجی کے

ہم پر یہ سختی کی نظر؟ ہم ہیں فقیرِ رہ گزر
رستہ کبھی روکا ترا؟ دامن کبھی تھاما ترا؟

یہ آواز "کل چودھویں کی رات تھی، شب بھر رہا چرچا ترا" والے انشاجی کی ہے.... چاند نگر کی یہی ادا اس اداس چاندنی انشاجی کی نثر پر بھی چھٹکی ہوتی ہے۔ بے شمار خوبصورت لیکن متروک اور بھولے بسرے الفاظ کو ان کی رواں دواں نثر نے ایک نئی زندگی اور توانائی بخشی ہے۔ اردو مزاح میں یہ اسلوب اور یہ آہنگ نیا ہی نہیں، ناقابلِ تقلید بھی ہے۔

انشاجی کے مزاح میں جہاں لفظی اُلٹ پھیر، تلازمات اور تمسخر کی گنجائش نہیں، وہاں وہ تلخ و ترش سے بھی پاک ہے۔ ان کے لئے موضوع واقعہ یا کردار کا بذاتہ مضحک ہونا چنداں ضرورت نہیں۔ چنانچہ شاید ہی دنیا و عقبیٰ کا کوئی موضوع ان کے خندہ بے ضرر سے محفوظ رہا ہوگا۔

صد رنگ مری موج ہے، میں طبع رواں ہوں

مسائل حاضرہ و غیر حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ تلخیٔ دوراں کا گلہ نہیں کرتے۔ یہ اُن کے مزاح کا کرشمہ نہیں تو کیا ہے کہ انھوں نے آلام سیاست کو بھی سادہ دل بندوں کے لئے

آسان بنا دیا۔ ان کی نگاہ بے محابا سے کچھ نہیں بچتا۔ لیکن وہ اپنے مشاہدے سے مجروح و مغموم نہیں ہوتے بلکہ یہ کہہ کر بے نیازانہ آگے بڑھ جاتے ہیں :

"میں آیا۔ میں نے دیکھا۔ میں مُسکرا دیا"

بچھو کا کاٹا روتا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ انشا جی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا بھی ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ اُردو مزاح کے سنہری دور میں جی رہے ہیں۔ رشید احمد صدیقی، کرنل محمد خاں، شفیق الرحمٰن، محمد خالد اختر، سید ضمیر جعفری —— کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے کسی دور میں ایسا اور اتنا شگفتہ و شائستہ، منفرد و متنوع طنز و مزاح تخلیق نہیں کیا گیا اور ابن انشا بلاشبہ اس قبیلے کی آنکھ کا تارا ہیں۔ سادگی و پُرکاری شگفتگی و بے ساختگی میں وہ اپنا حریف نہیں رکھتے۔ ان کی تحریر ہماری ہماری ادبی زندگی میں ایک سعادت اور نعمت کا درجہ رکھتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی

۱۵ جون ۱۹۷۱ء

باعث تحریر آنکہ

یہ کتاب ہم نے لکھ تو لی لیکن جب چھاپنے کا ارادہ ہوا تو لوگوں نے کہا ایسا نہ ہو کہ یہ کورس میں لگ جائے یعنی ٹیکسٹ بک بورڈ والے اسے منظور کرلیں اور عزیز طالب علموں کا خون ناحق تمہارے حساب میں لکھا جائے جن سے اب بھی ملکہ نور جہاں کے حالات پوچھے جائیں تو ملکہ ترنم نور جہاں کے حالات بتاتے ہیں۔ ہم نے امتحاناً اس کا مسودہ ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین میر نسیم محمود صاحب کو بھجوا دیا اور جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا انھوں نے گہرا غور و خوض کرنے کے بعد اُسے نامنظور کر دیا۔ میر صاحب کوئی بات غلط کریں یا صحیح، اس سے پہلے گہرا غور و خوض ضرور کرتے ہیں۔ ان سے پہلے یہ ہو چکا ہے کہ ایک صاحب کسی کام سے ٹیکسٹ بک بورڈ گئے۔ وہاں اپنے پسندیدہ فلمی نغمات کی کاپی بھول آئے۔ بورڈ نے اسی کو منظور کرکے پرائمری کے نصاب میں داخل کر دیا۔

ہم محکمہ ہائے تعلیم کے بھی ممنون ہیں جنھوں نے اسکولوں کو سرکلر بھیج کر ہدایت کی ہے کہ اس کتاب کو نہ خریدا جائے۔ چنانچہ ہمیں ہر روز اسکول لائبریریوں کی

طرف سے بے شمار آرڈر موصول ہو رہے ہیں کہ یہ کتاب ہمیں نہ بھیجی جائے، اتنے کہ ہمارے لئے ان کی تعمیل کرنا دشوار ہو رہا ہے۔

ہم نے اس کتاب میں کوئی نئی بات نہیں لکھی، ویسے تو آجکل کسی بھی کتاب میں کوئی نئی بات لکھنے کا رواج نہیں لیکن ہم نے بالخصوص وہی کچھ لکھا ہے جو برسوں پہلے پڑھا تھا۔ اتنا ہے کہ یہ دن بڑے ہنگاموں کے تھے۔ صدر ایوب گئے۔ جلسے جلوس آتے۔ جمہوریت، سوشلزم، فتوے اور الیکشن کے غلغلے بلند ہوتے۔ اس شور میں تاریخ، جغرافیہ حساب گرامر سبھی اسباق میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ تاریخ ہند میں نئے پرانے بادشاہ باہم خلط ملط ہو گئے۔ اکبر کے نورتنوں میں بھی اُدل بدل ہو گئی حتّٰی کہ مناظر قدرت اور ستاروں وغیرہ کا احوال لکھتے ہوتے بھی ہماری نظریں آسمان سے زیادہ زمین پر رہیں۔ بعض بادشاہوں کا احوال ہمیں اولیا اللہ کے باب میں لکھنا تھا لیکن بادشاہوں ہی میں لکھ گئے ہیں۔ اس میں ہماری نیت کا قصور نہیں، تاریخی واقعات کا قصور ہے۔ پڑھتے ہوتے یہ ملحوظ رکھا جاتے کہ یہ کتاب صرف بالغوں کے لئے ہے۔ ذہنی بالغوں کے لئے، معمّر نابالغوں کے لئے نہیں۔

ابن انشا

۲۵ جون ۱۹۷۱ء

ترتیب

دوسری دفعہ کا ذکر ہے

بیان جانوروں کا

احوال چند پرندوں کا

گردوپیش کی چیزیں

طبع سوم کے موقع پر ہم نے ایک آدھ مضمون نکال دیا ہے اور چند دیگر مضامین، جو طبع اوّل اور طبع دوم کے وقت روک لیے تھے، داخل کر دیئے ہیں۔ کتابت کا انداز بدلنے اور سطور بڑھانے سے صفحات ضرور کم ہو گئے ہیں۔ مندرجات میں فرق نہیں پڑا۔ ترتیب میں بہت کچھ ردّ و بدل روا رکھی گئی ہے۔ قاری کی دلچسپی کے نقطۂ نظر سے۔

حالاتِ حاضرہ پر لکھنے میں یہ قباحت ہے کہ حالات کبھی حاضر نہیں رہتے۔ صدر ایوب کا دَور اور اس کی بہاریں ماضی قریب سے ماضی بعید کی طرف اڑی جا رہی ہیں۔ مشرقی پاکستان اور بنگالی بھائی اب قصہ پارینہ ہیں۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ' بھی دُنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ آخر فنا، آخر فنا — لیکن چونکہ ہماری قوم کے لئے ابھی عبرت پکڑنے کی ضرورت ختم نہیں ہوئی — اس کتاب کی ضرورت بھی باقی ہے۔

۱۷ر ستمبر ۱۹۷۲ء

ابن انشا



ایک دُعا

"یا اللہ
کھانے کو روٹی دے!
پہننے کو کپڑا دے!
رہنے کو مکان دے!
عزت اور آسودگی کی زندگی دے!!"

میاں یہ بھی کوئی مانگنے کی چیزیں ہیں؟
کچھ اور مانگا کر"

بابا جی! آپ کیا مانگتے ہیں؟

'میں؟'

میں یہ چیزیں نہیں مانگتا۔

میں تو کہتا ہوں

اللہ میاں — مجھے ایمان دے!

نیک عمل کی توفیق دے!!

"بابا جی! آپ ٹھیک دعا مانگتے ہیں۔

انسان وہی چیز تو مانگتا ہے،

جو اس کے پاس نہیں ہوتی"

یکم مارچ ۷۰ء



ہمارا مُلک

"ایران میں کون رہتا ہے ؟"

"ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے ۔"

"انگلستان میں کون رہتا ہے ؟"

"انگلستان میں انگریز قوم رہتی ہے ۔"

"فرانس میں کون رہتا ہے ؟"

فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے "

"یہ کون سا ملک ہے ؟"

"یہ پاکستان ہے ۔"

"اس میں پاکستانی قوم رہتی ہو گی ؟"

" نہیں۔ اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی "۔
" اس میں سندھی قوم رہتی ہے "
" اس میں پنجابی قوم رہتی ہے "
" اس میں بنگالی قوم رہتی ہے "
اس میں یہ قوم رہتی ہے۔
اس میں وہ قوم رہتی ہے "۔

" لیکن ــــ پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں !
سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں !
بنگالی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں !
پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا تھا ؟ "

" غلطی ہوئی۔ معاف کر دیجیے۔ آئندہ نہیں بنائیں گے "۔

۲۴ دسمبر ۶۹ء





ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

کسی ملک میں ایک تھا بادشاہ۔ بڑا دانش مند، مہربان اور انصاف پسند۔ اس کے زمانے میں ملک نے بہت ترقی کی اور رعایا اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ اس بات کی شہادت نہ صرف اس زمانے کے محکمہ اطلاعات کے کتابچوں اور پریس نوٹوں سے ملتی ہے بلکہ بادشاہ کی خود نوشت سوانح عمری سے بھی۔

٭

شاہ جمجاہ کے زمانے میں ہر طرف آزادی کا دَورہ دَورہ تھا۔ لوگ آزاد تھے اور اخبار آزاد تھے کہ جو چاہیں کہیں، جو چاہیں لکھیں۔ بشرطیکہ وہ بادشاہ کی تعریف میں ہو، خلاف نہ ہو۔

اس بادشاہ کا زمانہ ترقی اور فتوحات کے لئے مشہور ہے۔ ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی نظر آتی تھی، کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ جو لوگ لکھ دیتے تھے،

دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی ہو گئے۔ حسنِ انتظام ایسا تھا کہ امیر لوگ سونا اُچھالتے اُچھالتے ملک کے اِس سرے سے اُس سرے تک، بلکہ بعض اوقات بیرونِ ملک بھی چلے جاتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پوچھے اتنا سونا کہاں سے آیا اور کہاں لیے جا رہے ہو۔

روحانیت سے شغف تھا۔ کئی درویش اُسے ہوائی اڈے پر لینے چھوڑنے جاتے یا اُس کی کامرانی کے لئے چلّے کاٹتے تھے۔ طبیعت میں عفو اور درگزر کا مادہ از حد تھا۔ اگر کوئی آ کر شکایت کرتا تھا کہ فلاں شخص نے میری فلاں جائداد ہتھیالی ہے' یا فلاں کارخانے پر قبضہ کر لیا ہے' تو مجرم خواہ بادشاہ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو' وہ کمال سیر چشمی سے اُسے معاف کر دیتے تھے۔ بلکہ شکایت کرنے والوں پر خفا ہوتے تھے کہ عیب جوئی بُری بات ہے۔

جب بادشاہ کا دل حکومت سے بھر گیا تو وہ اپنی چیک بُکیں لے کر تارکِ دُنیا ہو گیا اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا کچھ لوگ کہتے ہیں اب بھی زندہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

برکاتِ حکومتِ غیر انگلشیہ

عزیزو! بہت دن پہلے اس ملک میں انگریزوں کی حکومت ہوتی تھی، اور درسی کتابوں میں ایک مضمون "برکاتِ حکومتِ انگلشیہ" کے عنوان سے شامل رہتا تھا۔ اب ہم آزاد ہیں۔ اُس زمانے کے مصنف حکومتِ انگلشیہ کی تعریف کیا کرتے تھے، کیونکہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ ہم اپنے عہد کی آزاد اور قومی حکومتوں کی تعریف کریں گے۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔

عزیزو! انگریزوں نے کچھ اچھے کام بھی کئے لیکن اُن کے زمانے میں خرابیاں بہت تھیں۔ کوئی حکومت کے خلاف بولتا تھا یا لکھتا تھا تو اس کو جیل بھیج دیتے تھے — اب نہیں بھیجتے۔ رشوت ستانی عام تھی۔ آج کل نہیں ہے۔ دکاندار چیزیں مہنگی بیچتے تھے اور ملاوٹ بھی کرتے تھے۔ آج کل کوئی مہنگی نہیں بیچتا، ملاوٹ بھی نہیں کرتا۔ انگریزوں کے زمانے میں امیر اور جاگیردار عیش کرتے تھے، غریبوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ اب امیر لوگ عیش نہیں کرتے اور غریبوں کو ہر کوئی اتنا پوچھتا ہے کہ وہ تنگ آجاتے ہیں۔ خصوصاً حق رائے دہندگی بالغاں کے بعد سے۔

تعلیم اور صنعت و حرفت کو لیجئے۔ ربع صدی کے مختصر عرصے میں ہماری شرح

خواندگی اٹھارہ فی صدی ہو گئی ہے۔ غیر ملکی حکومت کے زمانے میں ایسا ہو سکتا تھا؟ انگریز شروع شروع میں ہمارے دستکاروں کے انگوٹھے کاٹ دیتے تھے، اب کارخانوں کے مالک ہمارے اپنے لوگ ہیں۔ دستکاروں کے انگوٹھے نہیں کاٹتے ہاں کبھی کبھی پورے دستکار کو کاٹ دیتے ہیں۔ آزادی سے پہلے ہندو بنیئے اور سرمایہ دار ہمیں لوٹا کرتے تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ یہ سلسلہ ختم ہو اور ہمیں مسلمان بنئے اور سیٹھ لُوٹیں۔ الحمدللہ کہ یہ آرزو پوری ہوئی۔ جب سے حکومت ہمارے ہاتھ میں آئی ہے۔ ہم نے ہر شعبے میں بہت ترقی کی ہے۔ درآمد برآمد بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ ہماری خاص برآمدات دو ہیں۔ وفود اور زرمبادلہ۔ درآمدات ہم گھٹاتے جا رہے ہیں۔ ایک زمانہ میں تو خارجہ پالیسی تک باہر سے درآمد کرتے تھے۔ اب یہاں بننے لگی ہے۔

ایک سبق جغرافیے کا

جغرافیہ میں سب سے پہلے یہ بتایا جاتا ہے، کہ دنیا گول ہے۔ ایک زمانے میں بے شک یہ چپٹی ہوتی تھی۔ پھر گول قرار پائی۔ گول ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ مشرق کی طرف سے جاتے ہیں مغرب کی طرف جا نکلتے ہیں۔ کوئی ان کو پکڑ نہیں سکتا۔ اسمگلروں مجرموں اور سیاست دانوں کے لئے بڑی آسانی ہو گئی۔

ہٹلر نے زمین کو دوبارہ چپٹا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔

پرانے زمانے میں زمین گل محمد کی طرح ساکن ہوتی تھی۔ سورج اور آسمان وغیرہ اس کے گرد گھوما کرتے تھے۔ شاعر کہتا ہے۔ رات دن گردش میں ہیں سات آسمان۔ پھر گلیلیو نامی ایک شخص آیا اور اس نے زمین کو سورج کے گرد گھمانا شروع کر دیا۔ پادری بہت ناراض ہوئے کہ یہ ہم کو کس چکر میں ڈال دیا ہے۔ گلیلیو کو تو انھوں نے قرار واقعی سزا دے کر آئندہ اس قسم کی حرکات سے روک دیا۔ زمین کو البتہ نہیں روک سکے۔ برابر حرکت کئے جا رہی ہے۔

شروع میں دنیا میں تھوڑے ہی ملک تھے۔ لوگ خاصی امن چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ پندرھویں صدی میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ اس کے بارے میں دو نظریئے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا قصور نہیں یہ ہندوستان کو یعنی ہمیں دریافت کرنا چاہتا تھا، غلطی سے امریکہ کو دریافت کر بیٹھا۔ اس نظریئے کو اس بات

سے تقویت ملتی ہے کہ ہم ابھی تک دریافت نہیں ہو پاتے۔

دوسرا فریق کہتا ہے کہ نہیں، کولمبس نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی یعنی امریکہ دریافت کیا۔ بہرحال اگر یہ غلطی بھی تھی تو بہت سنگین غلطی تھی۔ کولمبس تو مر گیا، اس کا خمیازہ ہم لوگ بھگت رہے ہیں۔

پاکستان

حدودِ اربعہ: پاکستان کے مشرق میں سیٹو ہے۔ مغرب میں سنٹو۔ شمال میں تاشقند اور جنوب میں پانی۔ یعنی جائے مفر کسی طرف نہیں۔

پاکستان کے دو حصے ہیں: مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان۔ یہ ایک دوسرے سے بڑے فاصلے پر ہیں۔ کتنے بڑے فاصلے پر، اس کا اندازہ اب ہو رہا ہے۔

دونوں کا اپنا اپنا حدودِ اربعہ بھی ہے۔

مغربی پاکستان کے شمال میں پنجاب۔ جنوب میں سندھ۔ مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں سرحد اور بلوچستان ہیں۔ یہاں پاکستان خود کہاں واقع ہے اور واقع ہے بھی کہ نہیں اس پر آج کل ریسرچ ہو رہی ہے۔

مشرقی پاکستان کے چاروں طرف آج کل مشرقی پاکستان ہی ہے۔

بھارت

یہ بھارت ہے۔ گاندھی جی یہیں پیدا ہوئے تھے۔ لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان کو مہاتما کہتے تھے۔ چنانچہ مار کر ان کو یہیں دفن کر دیا اور سمادھی بنا دی' دوسرے ملکوں کے بڑے لوگ آتے ہیں تو اس پر پھول چڑھاتے ہیں۔ اگر گاندھی جی نہ مرتے یعنی نہ مارے جاتے تو پورے ہندوستان میں عقیدت مندوں کے لیئے پھول چڑھانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ یہی مسئلہ ہمارے یعنی پاکستان والوں کے لیئے بھی تھا۔ ہمیں قائد اعظم کا ممنون ہونا چاہیئے کہ خود ہی مر گئے اور سفارتی نمائندوں کے پھول چڑھانے کی ایک جگہ پیدا کر دی ورنہ شاید ہمیں بھی ان کو مارنا ہی پڑتا۔

بھارت بڑا امن پسند ملک ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اکثر ہمسایہ ملکوں کے ساتھ اس کے سیز فائر کے معاہدے ہو چکے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ہمارے ساتھ ہوا۔ اس سے پہلے چین کے ساتھ ہوا۔

بھارت کا مقدس جانور گائے ہے۔ بھارتی اسی کا دودھ پیتے ہیں۔ اسی کے گوبر سے چوکا لیپتے ہیں اور اسی کو قصائی کے ہاتھ بیچتے ہیں' کیونکہ خود وہ گائے کو مارنا یا کھانا پاپ سمجھتے ہیں۔

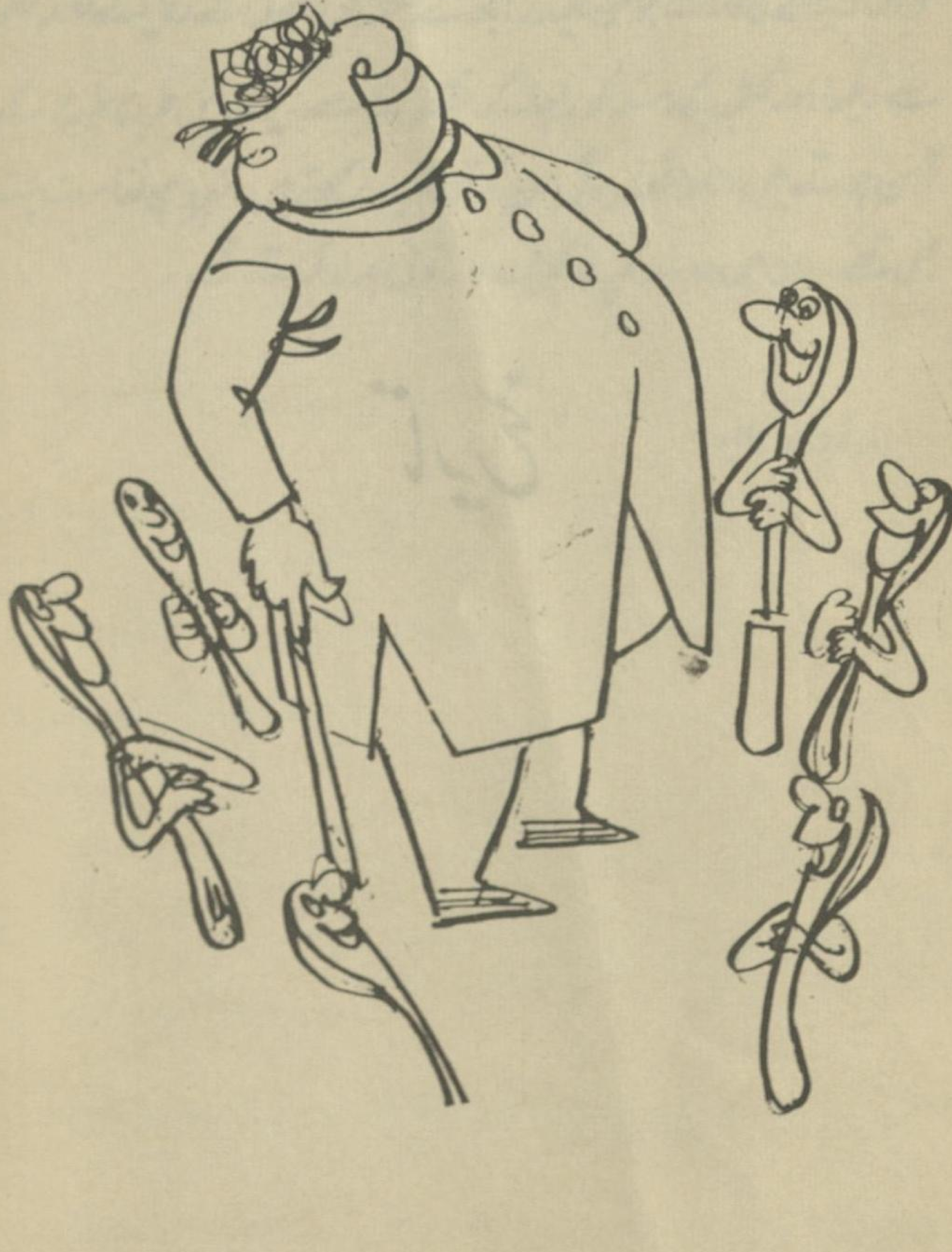
آدمی کو بھارت میں مقدس جانور نہیں گنا جاتا۔

بھارت کے بادشاہوں میں راجہ اشوک اور راجہ نہرو مشہور گزرے ہیں۔

اشوک سے ان کی لاٹ اور دہلی کا اشوکا ہوٹل یادگار ہیں اور نہرو جی کی یادگار مسئلہ کشمیر ہے۔ جو اشوک کی تمام یادگاروں سے زیادہ مضبوط اور پائیدار معلوم ہوتا ہے۔ راجہ نہرو بڑے دھرماتما آدمی تھے۔ صبح سویرے اُٹھ کر شیر شک آسن کرتے تھے۔ یعنی سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے کھڑے ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کو ہر معاملے کو الٹا دیکھنے کی عادت ہو گئی۔ حیدر آباد کے مسئلہ کو انھوں نے رعایا کے نقطۂ نظر سے دیکھا اور کشمیر کے مسئلہ کو راجا کے نقطۂ نظر سے۔ یوگ میں طرح طرح کے آسن ہوتے ہیں۔ ناواقف لوگ ان کو قلابازیاں سمجھتے ہیں۔ نہرو جی نفاست پسند بھی تھے۔ دن میں دو بار اپنے کپڑے اور قول بدلا کرتے تھے۔

۸ر فروری ۱۹۷۰ء

تاریخ



تاریخ کے چند دَور

راہوں میں پتھر
جلسوں میں پتھر
سینوں میں پتھر
عقلوں پہ پتھر
آستانوں پہ پتھر
دیوانوں پہ پتھر
پتھر ہی پتھر
یہ زمانہ پتھر کا زمانہ کہلاتا ہے۔

دیگیں ہی دیگیں
چمچے ہی چمچے
سکے ہی سکے
پیسے ہی پیسے
سونا ہی سونا
چاندی ہی چاندی
یہ زمانہ دھات کا زمانہ کہلاتا ہے۔



لوگ سونے چاندی کی زنجیریں بناتے ہیں
ہمیں اور آپ کو پہناتے ہیں
ہم اور آپ پہن کر خوش رہتے ہیں
بلکہ تھینک یو بھی کہتے ہیں

ایک اور زمانہ ہے آئرن ایج
یعنی لوہے کا زمانہ

لوہا وہ دھات ہے
جس کا سب لوہا مانتے ہیں
ہل کا پھل بھی لوہا
کارخانے کی کل بھی لوہا
لوہا مقناطیس بن جاتا ہے
تو چاندی تک کو کھینچ لاتا ہے

سو سُنار کی ایک لوہار کی

سونے والے لوہے والوں سے ڈرتے ہیں
لیکن کوئی کہاں تک رُکوائے گا
ہمارے ہاں بھی لوہے کا زمانہ آئے گا
کچا لوہا اور کسی کام کا نہیں
بس اس سے آدمی بناتے ہیں
جو مردِ آہن کہلاتے ہیں
ان کو زنگ لگ جاتا ہے
بلکہ کھا جاتا ہے
پھر بھی لوگ گھورے پر سے اٹھا لاتے ہیں
زندہ باد کے نعروں سے جلاتے ہیں
یہ اور دَور ہے
لوگ ننگے گھومتے ہیں
ننگے ناچتے ہیں
ننگے کلبوں میں جاتے ہیں
ایک دوسرے کو جلسوں میں ننگا کرتے ہیں
عوام تک کے کپڑے اتار لیتے ہیں
بلکہ کھال کھینچ لیتے ہیں
کھالوں سے زرِ مبادلہ کماتے ہیں
گوشت کچا کھا جاتے ہیں

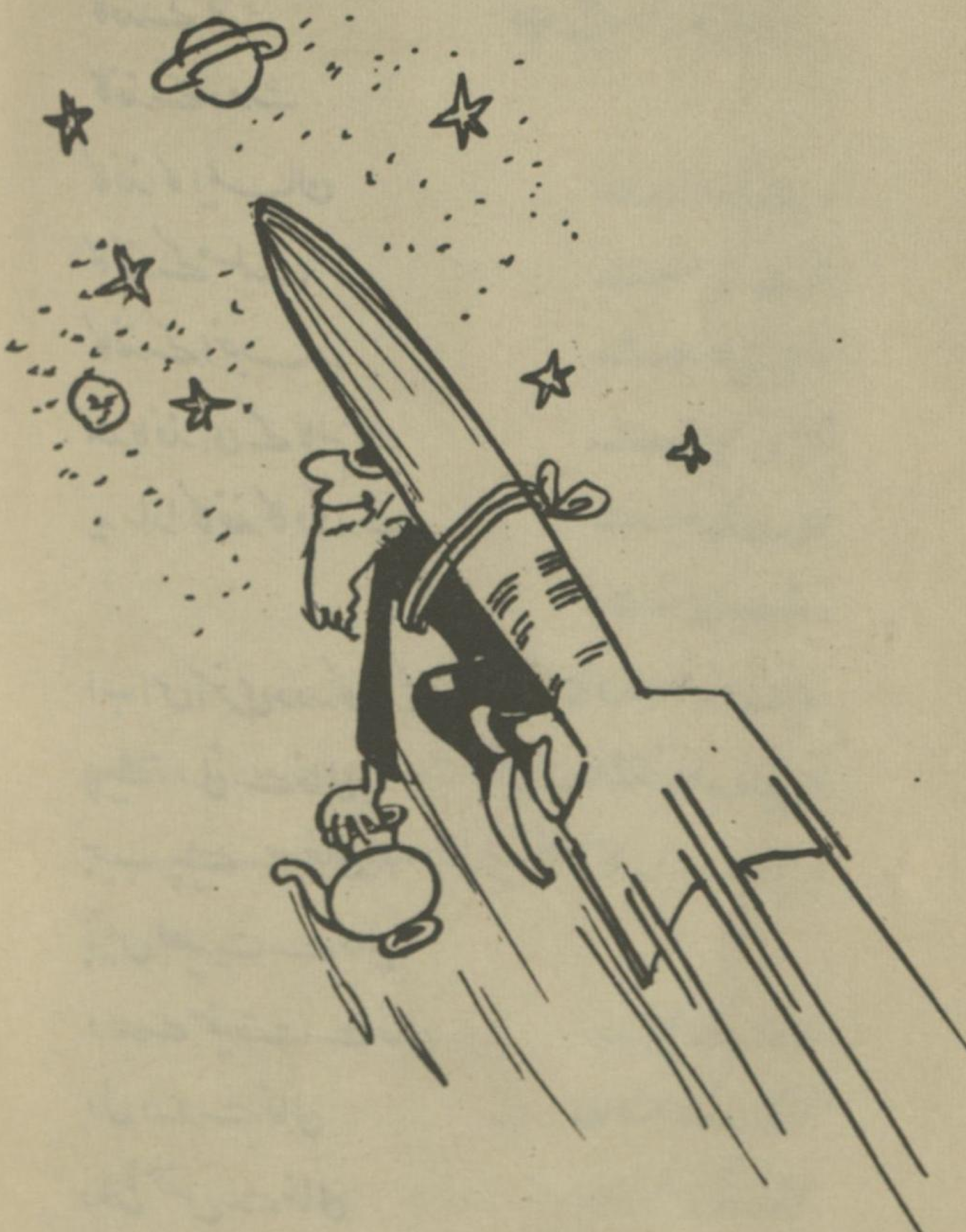
نہ چولھا ہے نہ سیخ ہے
یہ زمانہ قبل از تاریخ ہے

ملاوٹ کی صنعت
رشوت کی صنعت
کوٹھی کی صنعت
پگڑی کی صنعت
حلوے کی صنعت
مانڈے کی صنعت
بیانوں اور نعروں کی صنعت
تعویذوں اور گنڈوں کی صنعت
یہ ہمارے ہاں کا صنعتی دور ہے

کاغذ کے کپڑے
کاغذ کے مکان
کاغذ کے آدمی
کاغذ کے جنگل
کاغذ کے شیر
ذرا نم ہو تو سب کے سب ڈھیر

کاغذ کے نوٹ
کاغذ کے ووٹ
کاغذ کا ایمان
کاغذ کے مسلمان
کاغذ کے اخبار
اور کاغذ ہی کے کالم نگار
یہ سارا کاغذ کا دَور ہے

اب اس آخری دَور کو دیکھئے
پیٹ روٹی سے خالی
جیب پیسے سے خالی
باتیں بصیرت سے خالی
وعدے حقیقت سے خالی
دل درد سے خالی
دماغ عقل سے خالی
شہر فرزانوں سے خالی
جنگل دیوانوں سے خالی
یہ خلائی دَور ہے



لوگ توہم کے غبارے پھُلاتے ہیں
معجونِ فلک سیر کھاتے ہیں
رویتِ ہلال کمیٹیاں بناتے ہیں
آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں
ڈٹ کے دُنبے نوش فرماتے ہیں
بیت الخلا میں مدار پہ پہنچ جاتے ہیں
ہمارے ہاں کا خلائی دَور یہی ہے۔

۹ مارچ ۱۹۷۰ء

رامائن اور مہابھارت

رامائن

رامائن رامچندر جی کی کہانی ہے۔ یہ راجہ دشرتھ کے پرنس آف ویلز تھے۔ لیکن ان کی سوتیلی ماں کیکئی اپنے بیٹے بھرت کو راجا بنانا چاہتی تھی۔ اس کے بہکانے پر راجا دسرتھ نے رامچندر جی کو چودہ برس کے لئے گھر سے نکال دیا۔ ان کی رانی سیتا کو بھی۔ ان کے بھائی لچھمن بھی ساتھ ہو لیئے۔ بن باس کے لئے نکلتے وقت رامچندر جی کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ بس ایک کھڑاؤں تھی۔ وہ بھی بھرت نے رکھوا لی کہ آپ کی نشانی ہمارے پاس رہنی چاہیئے۔ اس کھڑاؤں کو بھرت تخت کے پاس بلکہ اُوپر رکھتا تھا تاکہ رامچندر جی کا کوئی آدمی چرا کے نہ لے جائے۔

جنگل میں رہنے کی وجہ سے ان کو گزارے میں چنداں تکلیف نہ ہوتی تھی۔ رام جی تو آخر رام جی تھے زیادہ کام ان کا لکشمن یعنی برادر خورد کیا کرتے تھے۔

یہ لوگ گن گن کر دن گزار رہے تھے کہ کب بارہ برس پورے ہوں اور کب یہ واپس جاکر راج پاٹ سنبھالیں اور رعایا کی بے لوث خدمت کریں۔ ایک روز جب کہ رام اور لچھمن، دونوں شکار کو گئے ہوئے تھے لنکا کا راجا راون آیا اور سیتا جی کو اٹھا

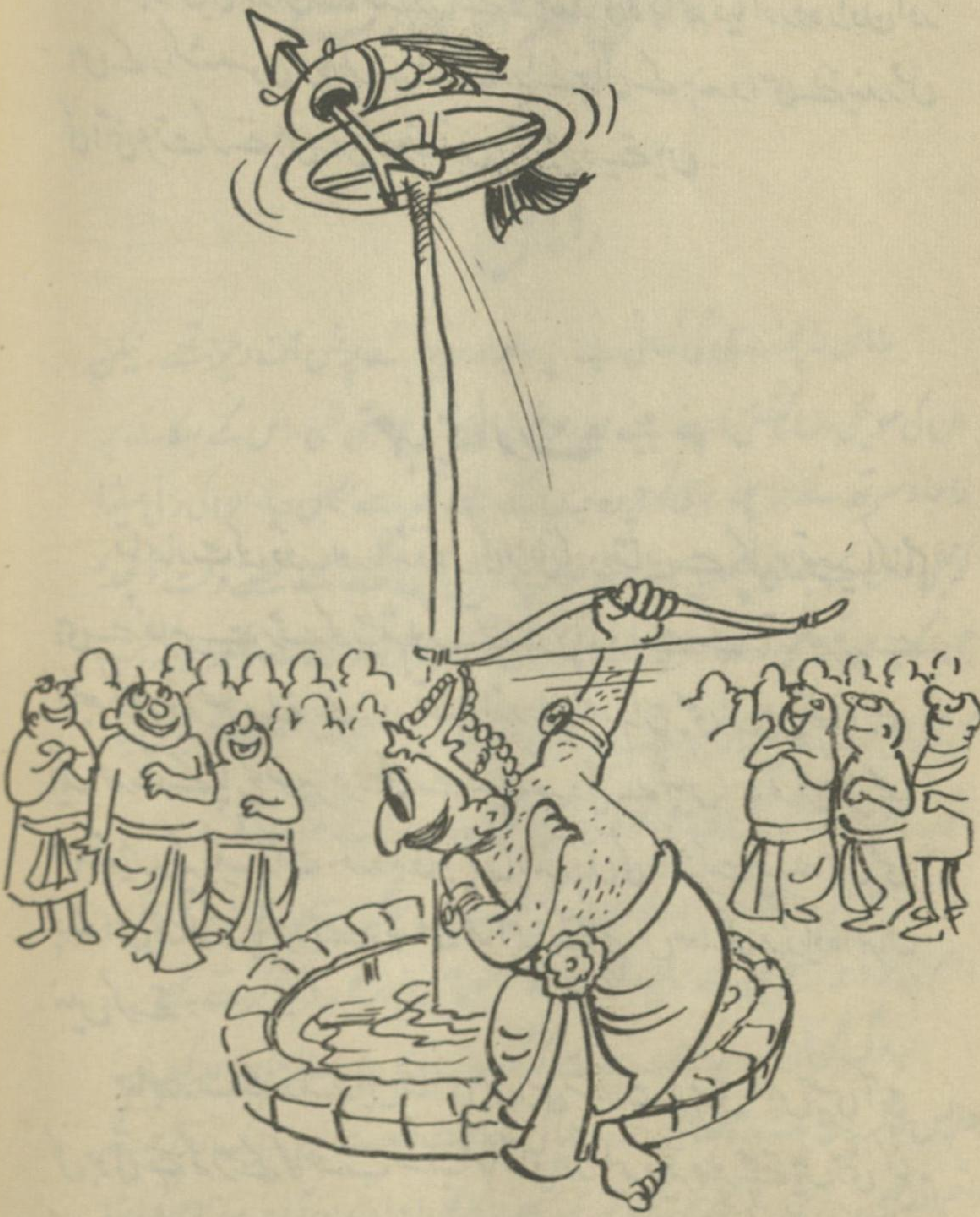
لے گیا۔ اس پر رامچندر جی اور راون میں لڑائی ہوئی۔ گھمسان کا رن پڑا جیسا کہ دُسہرے کے تہوار میں پڑتا آپ نے دیکھا ہو گا۔

ہنومان جی اور ان کے بندروں نے رامچندر جی کا ساتھ دیا اور وہ راون اور اس کے راکشسوں کو مار کر جیت گئے۔ پرانے خیال کے ہندو اسی لیئے بندروں کی اتنی عزت کرتے ہیں۔ ان کو انسانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

مہابھارت

مہابھارت کوروؤں اور پانڈوؤں کی لڑائی کی داستان ہے۔ کورو تو جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے بڑے کور چشم لوگ تھے، ہاں پانڈو اچھے تھے۔ اتنا ضرور ہے کہ کبھی کبھی جوُا کھیل لیتے تھے۔ اور تعدد ازدواج کا رواج بھی ان میں تھا، یعنی ایک عورت کے پانچ شوہر ہو سکتے تھے۔ یکے بعد دیگرے نہیں، وہ تو آج کل بھی ہوتے ہیں بلکہ بیک وقت۔ دروپدی پانچوں پانڈوؤں کی بلاشرکت غیرے بیوی تھی۔ چونکہ اس کا سلوک پانچوں سے یکساں تھا اس لئے ہم اس معاملے پر زیادہ اعتراض نہیں کرتے۔

مہابھارت کے زمانے میں شادی میں ایسی مشکلات نہ ہوتی تھیں جیسی آج کل ہوتی ہے کہ لڑکے کا حسب نسب، جائداد اور تعلیم وغیرہ پوچھتے ہیں حتیٰ کہ ذریعہ روزگار بھی۔ پنجابی یوپی کا سوال بھی اٹھتا ہے اور شیعہ سنی کی دیکھ پرکھ بھی



ہوتی ہے۔ مہابھارت کے سنہری زمانے میں لوگ سوئمبر رچاتے تھے۔ جو شخص بھی نیچے تیل کے کُنڈ میں عکس پر نظر جمائے اوپر گھومتی مچھلی کی آنکھ میں تیر کا نشانہ لگاتا تھا۔ اس کے سر اپنی لڑکی کو منڈھ دیتے تھے۔ دروپدی کے سوئمبر میں ارجن نے تیر مارا جو گھومتی مچھلی کی آنکھ میں سیدھا جا لگا۔ یہ حسنِ اتفاق تھا ورنہ تو ایسے کرتب کے لئے آدمی کا ماہر بازی گر یا نٹ ہونا ضروری ہے۔ ہم آپ نہیں لگا سکتے۔

کورو اور پانڈو میں لڑائی کیوں ہوئی تھی۔ یہ ہم نہیں جانتے۔ ہر لڑائی کے لئے وجہ کا ہونا ضروری بھی نہیں۔ اب کچھ آنکھوں دیکھا حال اس لڑائی کا سنیئے:

"خواتین وحضرات! یہ کوروکشیتر کا میدان ہے جو تحصیل کیتھل ضلع کرنال میں واقع ہے۔ لڑائی اب شروع ہونے ہی والی ہے۔ کورو ایک طرف ہیں۔ پانڈو دوسری طرف ہیں۔ یہ ہونا بھی چاہیئے۔ دونو ایک طرف ہوں تو لڑائی کا کچھ مزا نہ آئے۔ لڑنے والوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ میدان میں نظر آرہے ہیں۔ یہ درونا اچاریہ ہیں۔ دونو فریقوں کے بزرگ ہیں۔ اپنا لشکر کوروؤں کو دے رکھا ہے، اشیرواد پانڈوؤں کو دے رکھی ہے۔ پانڈوؤں کا مطالبہ تھا کہ آپ اشیرواد کوروؤں کو دے دیں لشکر ہمیں دے دیں لیکن اچاریہ جی نہیں مانے۔ یہ کون ہیں؟ یہ کرشن جی ہیں۔ مشہور افسانہ نگار کرشن نہیں، نہ مہاشہ کرشن۔ بلکہ اور صاحب ہیں، کرشن کنہیا کہلاتے ہیں۔ ابھی ابھی گوپیوں کے پاس سے آئے ہیں۔ مکھن ابھی تک ہونٹوں پر لگا ہے بیٹھے گیتا لکھ رہے ہیں۔ ارجن کو اُپدیش دے رہے ہیں کہ 'مارو' مارو۔ اپنوں کو مارو' جھجکو نہیں۔ تاج وتخت کا معاملہ ہے۔ مذاق کی بات نہیں"۔ یاد رہے کہ کورو

اور پانڈو ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ ایلو کھانڈے سے کھانڈا بجنے لگا اور رتھ سے رتھ ٹکرا رہا ہے۔ یہ لڑائی تو لمبی چلتی معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا اب ہم واپس سٹڈیو چلتے ہیں۔"

سوالات

۱۔ ارجن نے گھومتی مچھلی کی آنکھ میں تیر مارنے کے علاوہ بھی کبھی کوئی اور تیر مارا تھا؟
۲۔ بھارت اور پاکستان کی جنگ ستمبر ۶۵ء کا درونا چاریہ کون تھا؟
۳۔ کورو اور پانڈو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔

اس موضوع پر جواب مضمون لکھو۔ زیادہ سے زیادہ دس الفاظ میں آجانا چاہیئے۔

۲۸ دسمبر ۱۹۷۰ء

سکندر اعظم

یہ بادشاہ جو پنجاب کے ایک سابق وزیر اعظم اور پاکستان کے ایک سابق صدر کا ہمنام تھا، مقدونیہ کے بادشاہ فیلقوس کا بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد گدی پر بیٹھا جو اس کی سعادت کی دلیل ہے۔ باپ کی زندگی میں بیٹھ جاتا تو باپ کیا کر لیتا۔ مورخین نے سکندر کی شجاعت اور دوسری صلاحیتوں کی بہت تعریف کی ہے۔ مشہور مورّخ سہراب مودی بھی اپنے ایک فلم اسکرپٹ میں لکھتے ہیں کہ سکندر بہت اچھا بادشاہ تھا۔

سکندر یونان سے فوج لے کر نکلا اور ایران پہنچا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے دارا مارا، اور پھر ہندوستان کی راہ لی۔ جہلم کے قریب اس کی مڈبھیڑ راجا پورس سے ہوئی۔ اس زمانے میں راجاؤں کے نام بڑے اور ورش چھوٹے ہوتے تھے۔ جتنی بڑی راجا پورس کی سلطنت تھی اتنی بڑی بڑی تو پنجاب کے کئی زمینداروں کی جاگیریں ہیں۔ خیر لڑائی ہوئی چونکہ لڑائی میں ایک فریق کا ہارنا ضروری ہوتا ہے اور سکندر کی حیثیت ایک طرح سے مہمان کی تھی لہٰذا پورس ہار گیا۔ پکڑا آیا، اور سکندر کے سامنے پیش ہوا۔

سکندر نے دعا سلام، راضی باضی اور بھلو چنگو کے بعد پوچھا: "اے راجا پورس بتا تیرے سے کیا سلوک کیا جائے؟"

پورس نے کہا: "اے سکندر اعظم، حیف کہ تو اتنا بڑا بادشاہ ہو کر غلط زبان بولتا ہے یہ تیرے سے کہاں کی بولی ہے؟ ایسا تو گنوار بولتے ہیں۔ اب رہا سلوک کا سوال۔ بھلا



وہ سلوک جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں

یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ؟ وہ سلوک کر جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں :
سکندر نیا نیا بادشاہ ہوا تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ بادشاہ لوگ بادشاہوں سے کیا سلوک کیا کرتے ہیں۔ اس نے اپنے درباری مورخوں سے پوچھا۔ انھوں نے مثالیں دے کر جو کچھ بتایا اس کی روشنی میں سکندر نے کھڑے کھڑے تلوار نکال کر پورس کی بھتّاسی گردن اڑا دی۔ بعد میں پورس پچھتایا کہ میں نے ایسی احمقانہ فرمائش کی ہی کیوں تھی ؟

بعض تاریخوں میں یہ واقعہ اور طرح آیا ہے۔ لکھا ہے کہ پورس کی بات سن کر سکندر بہت خوش ہوا۔ شیخی میں آگیا۔ اس نے نہ صرف پورس کی جان بخشی کر دی بلکہ اس کا علاقہ بھی اس کو لوٹا دیا۔ ہو سکتا ہے یہی صحیح ہو۔ یہ اتنی پرانی بات ہے کہ اس پر اب بحث کرنا کرنا فضول ہے۔ پورس اس وقت نہیں مرا تو بعد میں مر گیا۔

واضح رہے کہ بعد میں سکندر بھی مر گیا۔ جس کا پس منظر بہت افسوس ناک ہے۔ مبینہ طور پر جناب خضر نے سکندر سے کہا تھا کہ چلو میرے ساتھ آبِ حیات کے چشمے پر۔ دو گھونٹ پی لینا اور ابد تک دنیائے فانی میں دندنانا، لوگوں کے سینے پر مونگ دلنا۔ وہاں پہنچ کر خضر صاحب سارا پانی خود پی گئے، سکندر کو سوکھا لوٹایا۔ جو کیا خضر نے سکندر سے، وہی کیا خضر حیات نے سکندر حیات سے۔ کیونکہ سکندر حیات تو مدت ہوئی لد گئے اس عمر میں جو لدنے کی نہ تھی اور خضر حیات جوان کے وزیر تھے ساٹھے پاٹھے اپنی جاگیر پر بیٹھے ہیں۔
اسکندر مرزا مرحوم کے خضر بھی خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں اور بخیریت ہیں

جس سے ثابت ہوا کہ آبِ حیات میں واقعی بڑی تاثیر ہے۔

سوالات

۱۔ سکندر حیات۔ سکندر مرزا اور سکندر اعظم میں سے کون بڑا فاتح تھا؟

۲۔ پورس کون تھا؟ کیا پورس اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے علاوہ بھی پنجاب میں کبھی کوئی دیسی حکمران ہوا ہے؟

۳۔ حسبِ ذیل میں سے کسی پانچ پر مضمون لکھو:
سکندر۔ خضر۔ سکندر حیات۔ خضر حیات

۴۔ فلم سکندر اعظم میں کس کس نے کام کیا تھا؟ اس کا کوئی گانا یاد ہو تو سناؤ۔

۴ جنوری ۱۹۷۱ء

خاندانِ غزنوی سے خاندانِ لودھی تک

سُلطان محمود غزنوی

یہ غزنوی خاندان کا سب سے مشہور بادشاہ تھا۔ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ شروع کے حملوں میں تو وہ چند ناگزیر وجوہ سے واپس جاتا رہا۔ آخر ہندوستان کو فتح کرلیا اس نے سومنات کا بت بھی توڑا جس میں سے زر و جواہر کا بہت بڑا خزانہ نکلا۔ ہر چند کہ سومنات کو اس نے صرف اپنا فرض سمجھتے ہوئے توڑا تھا، روپے کے لالچ میں نہیں۔ تاہم ان زر و جواہر کو اس نے پھینک نہیں دیا۔ اونٹوں پر لدوا کر اپنے ساتھ غزنی لے گیا۔

ایاز اس کا غلام تھا۔ علامہ اقبال سے روایت ہے کہ جب عین لڑائی میں وقتِ نماز آتا تھا تو یہ دونو یعنی محمود اور ایاز ایک صف میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ باقی فوج لڑتی رہتی تھی۔

محمود پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے فردوسی سے شاہنامہ لکھوایا اور اس کی ساٹھ ہزار اشرفیاں نہیں دیں بلکہ ساٹھ ہزار روپے دے کر ٹالنا چاہا۔ یہ الزام بے جا ہے۔ بیشک وعدہ ایک اشرفی فی شعر ہی کا کیا گیا تھا لیکن اس وقت گمان نہ تھا کہ فردوسی واقعی یہ کتاب لکھنے بیٹھ جائے گا اور اس کو اتنا لمبا کر دے گا۔ یہ کتاب جناب حفیظ جالندھری کے

شاہنامہ اسلام کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ فردوسی چاہتا تو بہت تھوڑے صفحوں پر ایران کی پوری تاریخ بیان کر سکتا تھا کہ فلاں بادشاہ نے فلاں بادشاہ کو مارا وغیرہ۔ لیکن وہ اس میں پہلوانوں اور اژدہوں وغیرہ کے قصے ڈال کر لمبا کرتا گیا۔ بھلا ایک کتاب کی ساٹھ ہزار اشرفیاں دی جاسکتی ہیں؟ بجٹ بھی تو دیکھنا پڑتا ہے۔ محمود کی ہم تعریف کریں گے کہ پھر بھی ساٹھ ہزار روپے کی رقم فردوسی کو بھجوائی۔ خواہ اس کے مرنے کے بعد ہی بھجوائی۔ آج کل کے پبلشر اور قدردان تو مرنے کے بعد بھی مصنف کو کچھ نہیں دیتے۔ ساٹھ ہزار روپے تو بڑی چیز ہے۔ ان سے ساٹھ روپے ہی وصول ہو جائیں تو مصنف اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہے۔

پس ثابت ہوا کہ سلطان موصوف بہت فیاض بھی تھا۔

سوالات

۱۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ کیا کئے تھے؟

۲۔ محمود غزنوی نے سترہ حملے کس ملک پر کئے تھے؟

۳۔ ہندوستان پر سترہ حملے کس بادشاہ نے کئے تھے۔ سچ سچ بتاؤ؟

۴۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر اٹھارہ حملے کیوں نہیں کئے؛ سترہ پر کیوں اکتفا کی؟

نوٹ: سوال نمبر ۴، ۱، ۳ اور ۲ لازمی ہیں۔

خاندانِ غوری

غزنوی خاندان کے بعد کسی نہ کسی خاندان کو تو آنا ہی تھا۔ چنانچہ غوری خاندان آیا۔ اس خاندان کا عہد بہت مختصر رہا۔ یہ لوگ اس بات پر غور ہی کرتے رہے کہ ملک کو کیسے ترقی دی جائے۔ کسی بات پر عمل کرنے کی مہلت نہ ملی۔ سلطان محمد غوری اس خاندان کا مشہور اور لیاقت مند بادشاہ تھا۔ ایک بار وہ گکھڑوں کی شورش رفع کرنے کے لئے ان کے علاقے نواحِ راولپنڈی میں گیا اور کسی گکھڑ کے ہاتھوں مارا گیا۔ حفیظ ہوشیارپوری اور رئیس امروہوی نے قطعاتِ تاریخ لکھے۔ اگر وہ گکھڑوں کے ہاں جانے کی بجائے ان کو اپنے ہاں بلاتا اور گھر بیٹھے ان کی شورش رفع کر دیتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔

خاندانِ غلاماں

اس خاندان کا بانی مبانی ایک شخص غلام محمد نامی تھا۔ اسی لئے یہ خاندان غلاماں کہلایا۔ دوسری وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس خاندان کے عہد میں بعض بڑی طاقتوں کے نام خطِ غلامی لکھا گیا۔ چونکہ اس خاندان کے بہت سے اعیانِ سلطنت کی عمر انگریز کی غلامی میں گزری تھی اس لئے بھی اس کو خاندان غلاماں کا نام دیا گیا۔

اس زمانے میں ذاتی اور انفرادی غلامی تو ختم ہو رہی تھی ہاں کسی ملک کا کسی دوسرے ملک کا غلام ہونا معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ آقا ملک اپنے غلام ملک ایڈ دیتا تھا۔ اپنی فالتو پیداوار بھیجتا تھا تاکہ سمندر میں نہ ڈبونی پڑے اور فالتو آدمی جن کا اس کے اپنے ملک میں کوئی مصرف نہ ہوتا تھا مشیر بنا کر ساتھ کر دیتا۔ غلام ملک کی ذمہ داریاں کچھ زیادہ نہ ہوتی تھی۔ بس حق ناحق میں آقا ملک کا ساتھ دینا ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں غلام ملک اپنے ہاں فولاد کا کارخانہ بھی نہ لگاتا تھا۔ خارجہ پالیسی بھی پوچھ کر بناتا تھا بلکہ آقا ملک سے بنی بنائی منگاتا تھا۔

خلجی خاندان

اس خاندان نے جتنے دن حکومت کو خود بھی خلجان میں مبتلا رہا۔ قوم کو بھی خلجان میں رکھا۔ اسی لئے اس کو خلجی خاندان کہتے ہیں۔ اس خاندان کے سربراہ کا نام بھی "خ" سے شروع ہوتا تھا۔ ایک شاعر نے یہ قصیدہ اسی کی شان میں لکھا تھا:

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں
گھوڑا تری گلی میں، نتھیا تری گلی میں

اس بادشاہ کے عہد میں فنِ طباخی کو بہت ترقی ہوئی۔ چرندوں پرندوں کے لئے یہ دور کچھ اچھا نہیں تھا۔ مرغ و ماہی بادشاہ کا نام سن کر تھر تھر کانپتے تھے۔ سودا نامی شاعر تو یہاں تک کہتا ہے کہ ؎

تڑپے تھا مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اردو کی مشہور کلاسیک مکمل مرغی خانہ باتصویر اسی عہد میں تصنیف ہوئی۔ اب تک اس کے ستر ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

تغلق خاندان

اس خاندان کے سرکاری دفاتر کراچی کے 'تغلق ہاؤس' میں تھے، اسی لئے یہ تغلق خاندان کہلایا۔ انہی دفاتر میں بیٹھے بیٹھے وزرائے سلطنت کو پہلے پہل خیال آیا کہ دارالحکومت بدلنا چاہیئے۔ دہلی سے دیوگری چلنا چاہیئے۔ اور کچھ نہیں تو تھوڑی تفریح ہی رہے گی۔ سفر کا بھتہ ہی ملے گا۔ اس منصوبے پر عمل بعد میں ہوا۔

تغلق کا لفظ اغلاق سے نکلا ہے جس کے معنی مشکل پسندی اور مشکل گوئی وغیرہ ہیں۔ ہمارے دوست عبدالعزیز خالد اس دور میں ہوتے تو ملک الشعرا ہوتے۔ ہر وقت خلعتِ فاخرہ زیب تن کیئے رہتے۔ یوں خالی بش شرٹ میں نہ گھوما کرتے۔

سرفیروز خاں تغلق اس خاندان کا مشہور بادشاہ تھا یہ اپنا رشتہ چنگیز خاں سے ملایا کرتا تھا اور کوٹلے بسایا کرتا تھا، چنانچہ فیروز شاہ کا کوٹلہ مشہور ہے۔ اس کی تصنیف ہیں تاریخ فیروز شاہی، فیروز اللغات اور چشم دید مشہور ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی تاریخ کی کتاب ہے، فیروز اللغات ایک لغات ہے اور چشم دید میں بادشاہ نے اپنے وہ حالات لکھے ہیں جو اپنی آنکھوں دیکھے ہیں۔

فیروز تغلق کے زمانے میں چیزیں سستی تھیں۔ کم از کم آج کے مقابلے میں آٹا دال بھی۔ بناسپتی گھی بھی۔ پٹرول بھی۔ اے کاش وہ آج بھی زندہ ہوتا اور ہمارا بادشاہ ہوتا۔

لودھی خاندان

اس خاندان کا مشہور ترین بادشاہ سکندر لودھی تھا۔ اس کو سکندر اعظم کے ساتھ خلط ملط نہ کرنا چاہیئے۔ وہ زمانہ قبل از مسیح میں ہوا تھا یہ زمانہ بعد از مسیح میں ہوا۔ بعض کتابوں میں اس خاندان کا نام لو بھی لکھا ہے جس کے معنی لالچی یعنی اقتدار کی لالچ رکھنے والا ہوتے ہیں، لیکن ہمارے خیال میں صحیح نام لودھی ہی ہے۔ اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ لودھیانے سے آیا ہوگا، جیسے یہ خاکسار آیا ہے۔ یہ خاکسار اپنے کو لودھی نہیں لکھتا جس کی وجہ خاکساری ہے۔

سکندر لودھی فیروز خاں تغلق کو معزول کر کے برسرِ اقتدار آیا تھا۔ اتفاق دیکھئے خود اس کے ساتھ یہی ہوا۔ اس کے سپہ سالار نے اُسے تخت سے اتار کر بعبور دریائے نور بھیج دیا یعنی ملک بدر کر دیا اور خاندانِ گندھارا کی بنیاد رکھی۔ خاندانِ گندھارا کی فرماں روائی ایک مدت تک اچھی چلی لیکن آخر سلطنت کے ٹکڑے ہونے شروع ہو گئے

حتیٰ کہ ملک بائیس خاندانوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایسا ہو جائے تو پھر مغل آیا ہی کرتے ہیں چنانچہ آتے ہی سلطنت مغلیہ قائم کی

سوالات

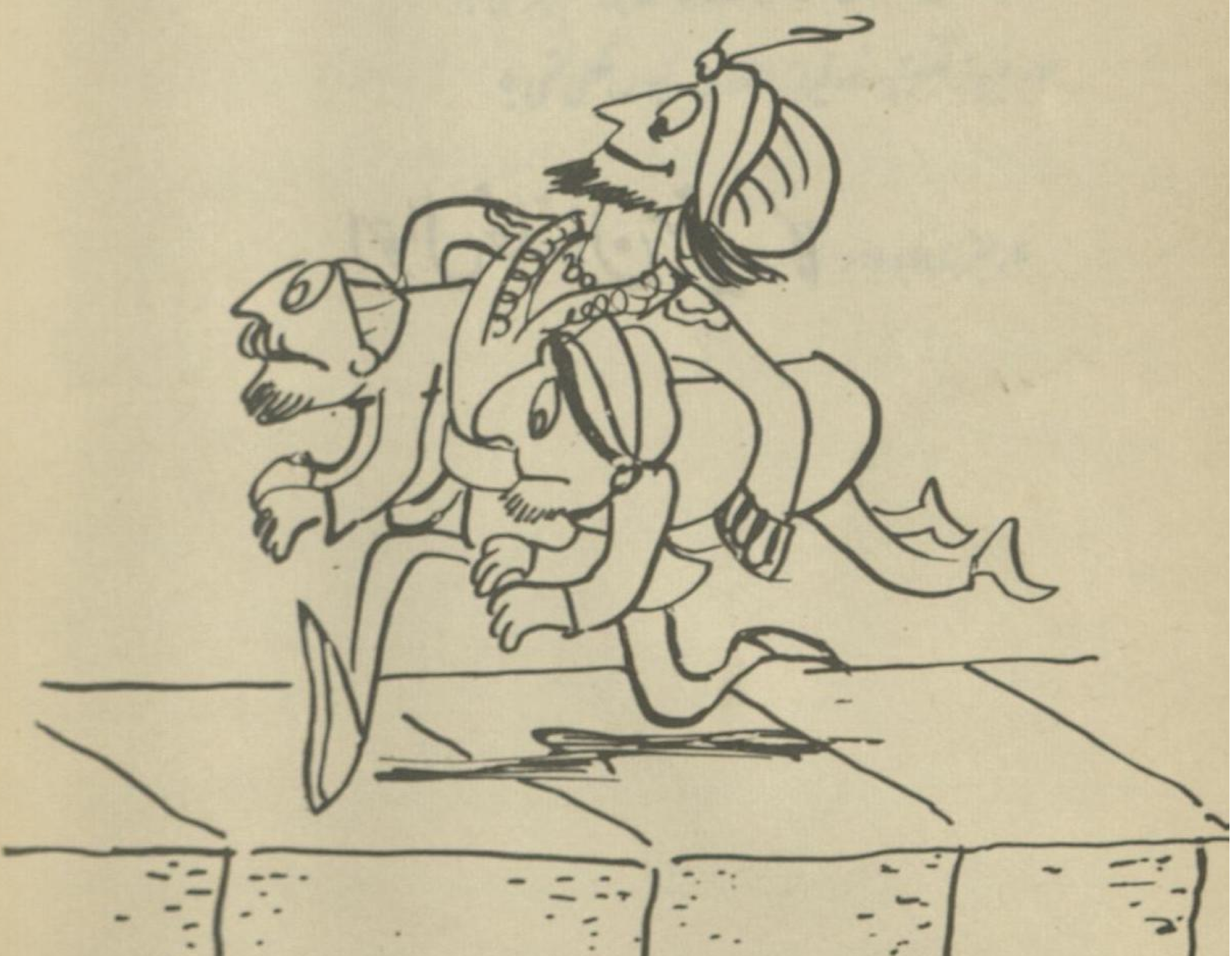
۱۔ گکھڑوں پر جواب مضمون لکھو لیکن ذرا دور رہ کر۔ یہ خطرناک لوگ ہیں۔

۲۔ کیا غلامی خاندان غلامان کے ساتھ ہی ختم ہوگئی؟

۳۔ فیروز تغلق نے فیروز اللغات کیوں لکھی تھی؟

۱۱ر جنوری ۱۹۷۱ء

احوال خاندانِ مغلیہ کا



بابر

بابر بادشاہ سمرقند سے ہندوستان آیا تھا تاکہ یہاں خاندان مغلیہ کی بنا ڈال سکے۔ یہ کام تو وہ بحسن وخوبی اپنے وطن میں بھی کر سکتا تھا البتہ پانی پت کی پہلی لڑائی میں اس کی موجودگی ضروری تھی۔ یہ نہ ہوتا تو وہ لڑائی ایک طرفہ ہوتی۔ ایک طرف ابراہیم لودھی ہوتا دوسری طرف کوئی بھی نہ ہوتا۔ لوگ اس لڑائی کا حال پڑھ پڑھ کر ہنسا کرتے۔

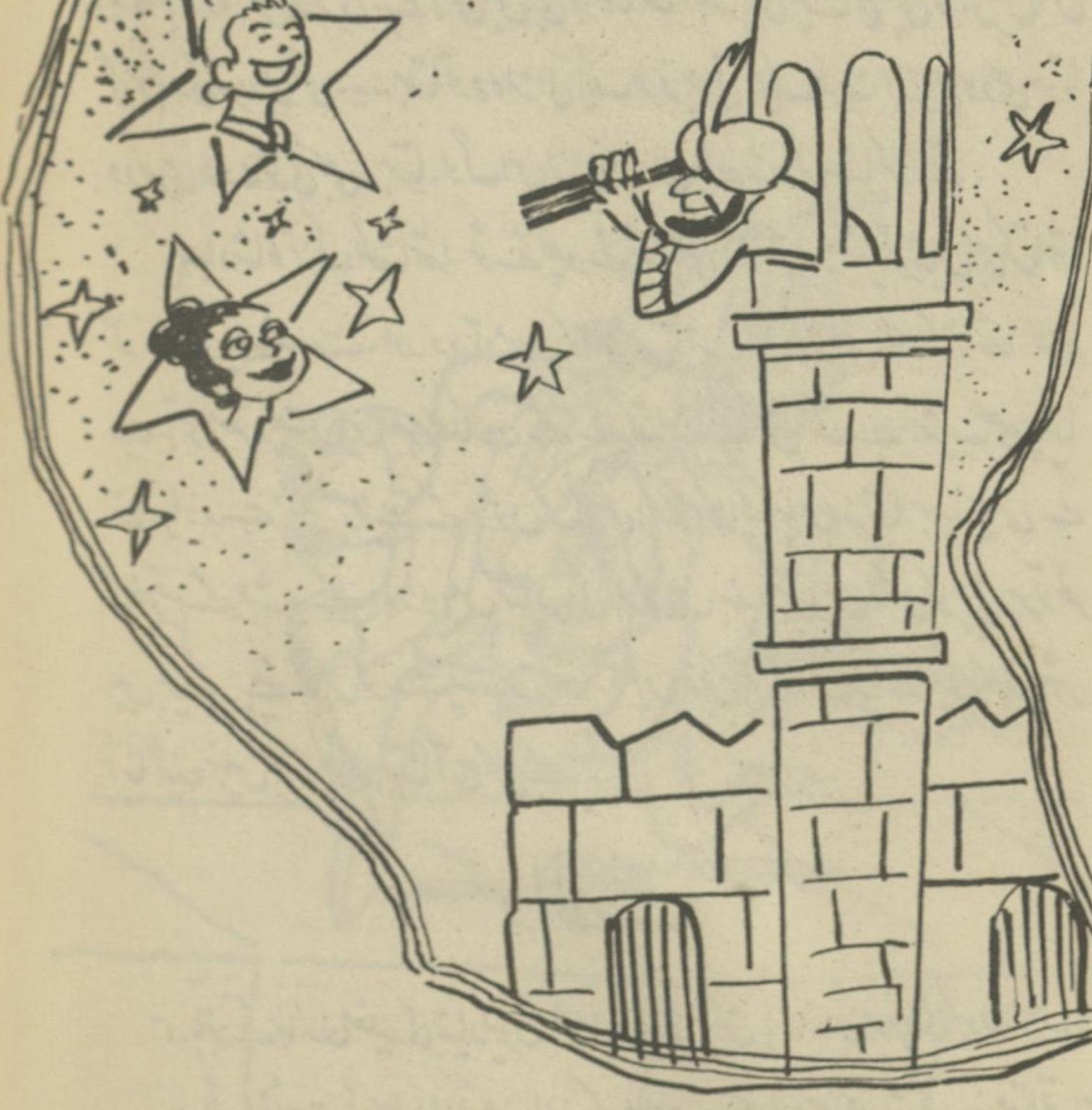
یہ بادشاہ تزک لکھتا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے شعر بھی کہتا تھا۔ پیشینگوئیاں بھی کرتا تھا کہ "عالم دوبارہ نیست"۔ اور دو آدمیوں کو بغل میں داب کر دوڑ بھی لگایا کرتا تھا۔ ظاہر ہے۔ اتنی مصروفیتوں میں امور مملکت کے لئے کتنا وقت نکل سکتا ہے۔ شراب بھی پیتا تھا۔ یاد رہے، اس زمانے کے لوگوں کو مذہبی احکام کا ایسا پاس نہ تھا جیسا ہمیں ہے کہ محرم کے عشرہ کے دوران میں شراب کی دوکانیں بند رہتی ہیں۔ کسی کو پینی ہو تو گھر میں بیٹھ کر پیئے۔ کابل کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہیں دفن ہوا۔ اس زمانے میں کابل شہر اتنا گندہ نہیں ہوتا ہوگا جتنا آج کل ہے۔

سوالات

۱۔ بابر نے خاندان مغلیہ کی بنیاد کیوں رکھی، خاندان تغلق یا خاندان موریا کی کیوں نہیں؟

۲۔ اگر پانی پت کی پہلی لڑائی میں بابر کے علاوہ ابراہیم لودھی بھی شریک نہ ہوتا تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا؟

۱۶ مارچ ۱۹۷۰ء



دیکھنا ہمایوں بادشاہ کا چھت پر چڑھ کر تارے

ہمایوں

ہمایوں بادشاہ نظام سقہ کا ہم عصر تھا جو ممتاز مفتی کے ایک مشہور ڈرامے کا ہیرو ہے اور چام کے دام چلایا کرتا تھا۔ بنگلے کا صوبہ اس کے تخت نشین ہوتے ہی خود مختار ہوگیا۔ چھ نکات پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ بہار اور گجرات کے حاکم اور راجپوت راجے بھی سرکشی پر آمادہ ہوگئے، جیئے بہار اور جیئے گجرات کے نعرے لگانے لگے۔ بادشاہ کرنسی اور امور خارجہ اور ڈیفینس اپنے پاس رکھ کر مصالحت پر آمادہ تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی راضی نہ ہوا۔ ایک شخص شیر شاہ نامی سکنہ بہار تو فوج لے کر بھی چڑھ دوڑا۔ ہمایوں نرم آدمی تھا۔ اس کی فوج بھی نرم دل تھی۔ جہاں شیر شاہ سامنے آتا تھا، پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ متعصب ہندو مورخین نے اِسے شکست سے تعبیر کیا ہے۔

ہمایوں سیر و تفریح کا دلدادہ تھا۔ دلّی سے جو نکلا تو راجپوتانہ کی سیر کی۔ سندھ کی سیر کی۔ ایران کی بھی سیر کی۔ ایران میں یہ پورے دس سال بیٹھا رہا تاکہ فارسی اچھی طرح سیکھ سکے اور بامحاورہ بول سکے۔ بعد میں انتظام مملکت شیر شاہ کو سنبھالنا پڑا۔ اسے حکومت کا چنداں تجربہ نہ تھا۔ بادشاہی ایک خاندانی کام ہے۔ شیر شاہ نے سوائے سڑکیں اور سرائیں بنانے۔ کنوئیں کھدوانے۔ چور پکڑنے اور ٹوڈرمل سے زمین کی جمع بندیاں کرنے کے کچھ نہ کیا۔ ہمایوں کا بیٹا اکبر سندھ کے سفر کے دوران امرکوٹ میں پیدا ہوا تھا۔ اصطلاح میں اُسے "نیا سندھی" بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہمایوں کو علم ہیئت کا بہت شوق تھا جو سائنس کی ایک قسم ہے۔ ایک روز چھت پر کھڑا ستارے دیکھ رہا تھا۔ اترتے میں پاؤں پھسلا اور مر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سائنس بعض اوقات خطرناک اور مہلک بھی ثابت ہوتی ہے اسی لئے تو ہمارے بزرگ اس سے چنداں رغبت نہ رکھتے تھے۔ صرف و نحو، عروض و منطق، اور علوم مجلسی پر تعلیم ختم کر دیتے تھے۔ زمین کا گول ہونا تک اس زمانے کی کتابوں سے ثابت نہیں اور سورج کے گرد چکر لگانا تو خیر اس نے بہت بعد میں شروع کیا!

سائنس اور ایجادات کے خلاف ہمارے پاس دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر ہمایوں کے زمانے میں پانی پائپوں اور نلوں کے ذریعے آیا کرتا تو نہ مشکیں ہوتیں نہ سقے۔ لہذا نہ اکبر ہوتا نہ شاہجہاں۔ نہ بادشاہی مسجد نہ تاج محل۔ نہ نورجہاں نہ اس کے کبوتر، کیونکہ ہمایوں بغیر اکبر کو پیدا کئے جمنا میں ڈوب گیا ہوتا۔ اللہ اللہ خیر سلّا۔

سوالات

۱۔ ہمایوں چھت پر کھڑا کون سے ستارے دیکھ رہا تھا۔ عام ستارے یا فلمی ستارے؟ تم کون سے ستارے دیکھ کر پھسلا کرو گے؟

۲۔ کیا آج کل بھی دو گھڑی کی بادشاہت میں رشتہ داروں کو فائدہ پہنچانے اور چام کے دام چلانے کا رواج ہے؟

۳۔ کیا ٹونٹی دار نلکے پر سوار ہو کر دریا پار کر سکتے ہیں؟

۴۔ سائنس اور ایجادات کے خلاف اور مثالیں تلاش کرو۔

اکبر

آپ نے حضرت ملا دوپیازہ اور بیربل کے ملفوظات میں اس بادشاہ کا حال پڑھا ہو گا۔ راجپوت مصوّری کے شاہکاروں میں اس کی تصویر بھی دیکھی ہو گی۔ ان تحریروں اور تصویروں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ سارا وقت داڑھی گھٹواتے، مونچھیں ترشوائے اُکڑوں بیٹھا پھول سونگھتا رہتا تھا یا لطیفے سُنتا رہتا تھا۔ یہ بات نہیں، اور کام بھی کرتا تھا۔

اکبر قسمت کا دھنی تھا۔ چھوٹا سا تھا کہ باپ یعنی ہمایوں بادشاہ تارے دیکھنے کے شوق میں کوٹھے سے گر کر جاں بحق ہو گیا اور تاج و تخت اُسے مل گیا۔ ایڈورڈ ہفتم کی طرح چونسٹھ برس ولی عہدی میں نہیں گزارنے پڑے۔ ویسے اس زمانے میں اتنی لمبی ولی عہدی کا رواج بھی نہ تھا۔ ولی عہد لوگ جونہی باپ کی عمر کو معقول حد سے تجاوز کرتا دیکھتے تھے اسے قتل کر کے، یا زیادہ رحم دل ہوتے تو قید کر کے، تخت حکومت پر جلوہ افروز ہو جایا کرتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ دن رعایا کی خدمت کا حق ادا کر سکیں۔

اب ہم اکبری عہد کے کچھ اہم واقعات کا ذکر کرتے ہیں:

پانی پت کی دوسری لڑائی

پانی پت میں اس وقت تک صرف ایک لڑائی ہوئی تھی پانی پت والوں کا اصرار



تھا کہ اب ایک اور ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اکبر نے پہلی فرصت میں بہیر و بنگاہ کے ساتھ اُدھر کا رخ کیا۔ اُدھر سے ہیموں بقال لشکر جرار لے کر آیا۔ اس کے ساتھ توپیں بھی تھیں اور ہاتھی بھی تھے، ایک سے ایک سفید۔ گھمسان کا رن پڑا۔ ہیموں کی جمعیت زیادہ تھی لیکن اکبری لشکر نے تابڑ توڑ حملے کر کے کھلبلی ڈال دی بعض ہمدردوں نے اس کے جدی وطن سے پیغام بھجوایا کہ تم اور ہیموں دونوں یہاں تاشقند آؤ، صلح کرائے دیتے ہیں لیکن اکبر نہ مانا —— ہیموں ایک ہاتھی کے ہودے میں بیٹھا روپے آنے پائی کا حساب لکھ رہا تھا کہ اس لڑائی کا مال غنیمت فروخت کر کے کس کاروبار میں پیسہ لگائے۔ ناگہاں ایک تیر قضا کا پیغام لے کر اس کی آنکھ میں آن لگا اور وہ بے سُدھ ہو کر گر گیا۔ ہیموں بقال کو ہم تاریخ کا پہلا موشے دایان کہہ سکتے ہیں۔

بیرم خاں کو حج کرانا

بیرم خاں اکبر کا اتالیق تھا۔ اُسی نے اس کی پرورش کی تھی اور تخت دلایا تھا۔ اکبر نے تخت پر بیٹھنے کے بعد جب سارے اختیارات قبضے میں کر لیے تو سوچا کہ پہلے اس محسن کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہیئے۔ چنانچہ بیرم خاں کو بلایا اور کہا —" خان بابا! اب آپ جائیے، حج کر آیئے۔" کسی کو حج پر بھیجنا خواہ وہ جانا چاہے یا نہ چاہے بڑی نیکی کا کام ہے۔ اکبر نے اور بھی کئی لوگوں کو اُن کے نہ نہ کرتے ہوئے حج و زیارت پر بھیجا۔ لیکن خود ناگریز وجوہات اور چند در چند مصروفیات کی وجہ سے کبھی نہ جا سکا۔

بیرم خاں حج کو جاتے ہوئے راستے میں قتل ہو گیا۔ لیکن یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ اکبر کو اس کے مرنے کی خبر ہوئی تو بہت رنج ہوا۔ ضرور ہوا ہو گا۔

دینِ الٰہی

دینیات کی طرف اکبر کے شغف کو دیکھتے ہوتے وزیر باتدبیر ابوالفضل نے اس کے ذاتی استعمال کے لئے ایک دینِ الٰہی ایجاد کر دیا تھا اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے پہلے خلیفہ کی ذمہ داریاں خود سنبھال لی تھیں۔ چڑھتے سورج کی پوجا کرنا اس مذہب کا بنیادی اصول تھا۔ مرید اکبر کے گرد جمع ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ اے ظلِ الٰہی، تو ایسا دانا و فرزانہ ہے کہ تجھ کو تاحیات سربراہ مملکت یعنی بادشاہ وغیرہ رہنا چاہیئے! اور تو ایسا بہادر ہے کہ تجھ کو ہلالِ جرأت ملنا چاہیئے بلکہ خود لے لینا چاہیئے۔ اس کے نام کا وظیفہ پڑھتے تھے، اور اس کی تعریف میں وقت بے وقت بیانات جاری کرتے رہتے تھے۔ پرستش کی ایسی رسمیں آج کل بھی رائج ہیں، لیکن ان کو دینِ الٰہی نہیں کہتے۔

اکبر کی حکمتِ عملی

اکبر میں تعصب بالکل نہ تھا خصوصاً شادیوں کے معاملہ میں۔ کچھ ریاستیں فوجوں سے فتح کیں، باقی کے راجاؤں کی بیٹیوں کو اپنے حرم میں اور اُن کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ آج کل کے سیٹھ اور مل مالک جو ایسا کرتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔

ادب کی سرپرستی وغیرہ

انار کلی ایک کنیز تھی جس کی وجہ سے شہزادہ سلیم کا اخلاق خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ اکبر نے اُسے دیوار میں چنوا دیا۔ ایک مصلحت اس میں یہ تھی کہ سید امتیاز علی تاج اپنا معرکہ آرا ڈرامہ لکھ سکیں اور اردو ادب کے ذخیرے میں ایک قیمتی اضافہ ہو سکے۔

درباری شاعر نظیریؔ نیشاپوری نے ایک بار کہا کہ میں نے لاکھ روپے کا ڈھیر کبھی نہیں دیکھا۔ بادشاہ نے ایک لاکھ روپے خزانے سے نکلوا کر ڈھیر لگا دیا۔ جب نظیریؔ اچھی طرح دیکھ چکا تو روپے واپس خزانے میں بھجوا دیئے۔ نظیریؔ دیکھنے کا دیکھتا رہ گیا۔ اصل میں نظیریؔ یہ حرکت خانخاناں کے ساتھ پہلے کر چکا تھا۔ خانخاناں نے شاعر کی نیت کو بھانپ کر کہہ دیا تھا کہ اچھا اب یہ ڈھیر تم اپنے گھر لے جاؤ۔ لیکن اکبر ایسا کچا آدمی نہ تھا۔

فتوحات

اکبر کا دور فتوحات کے لئے مشہور ہے۔ اس کی قلمرو بنگالے سے دکن اور گجرات تک پھیلی ہوئی تھی۔ کالنجر۔ میواڑ اور رنتھنبور کے راجاؤں کو اسی نے زیر کیا تھا۔ حکومت کے آخری دنوں میں قندھار بھی فتح کیا جسے قدیم زمانے میں گندھارا کہتے تھے۔ جب لوگوں نے اعتراض کیا کہ کیوں فتح کیا۔ تو بادشاہ کو بیان دینا پڑا کہ میں نے نہیں کیا۔ ہاں شہزادہ سلیم نے شاید کیا ہو۔ سو وہ میرے کہنے میں نہیں۔

سوالات

۱۔ پانی پت کی دوسری لڑائی بھی پانی پت ہی میں کیوں ہوئی؟ کہیں اور کیوں نہیں ہوتی

۲۔ اردو ڈرامہ وغیرہ کے فروغ میں حصہ لینے کا کیا طریقہ ہے؟

۳۔ تم ان پڑھ رہ کر اکبر بننا پسند کرو گے یا پڑھ لکھ کر اُس کا نورتن؟

اکبر کے نورتن

اکبر ان پڑھ تھا۔ بعض لوگوں کو گمان ہے کہ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے ہی اتنی عمدہ حکومت کر گیا۔ اس کے دربار میں پڑھے لکھے نوکر تھے، نورتن کہلاتے تھے۔ یہ روایت اس زمانے سے آج تک چلی آتی ہے کہ ان پڑھ لوگ پڑھے لکھوں کو نوکر رکھتے ہیں اور پڑھے لکھے اس پر فخر کرتے ہیں۔ ان نورتنوں کا حال ہم نیچے لکھتے ہیں:

راجا ٹوڈر مل

موتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈر مل اپنے زمانے کا بڑا لائق آدمی گنا جاتا ہے۔ اکبر کا دیوان ہونے سے پہلے یہ راجائے راجگان مہاراجہ سام گڑھ کی سرکار میں رہ چکا تھا اور اپنی وفاداری میں اب بھی ایسا راسخ تھا کہ جب تک علی الصبح اشنان کر کے مہاراجہ موصوف کی مورتی کو ڈنڈوت نہ کر لیتا تھا، کھانے کو ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ اکبر اس کے ولی نعمت سے دوستی رکھے، کسی اور سے نہ رکھے۔ لیکن بعض لوگ راجہ سام گڑھ کو اچھا نہ سمجھتے تھے، مثلاً ذوالفقار الدولہ خانخاناں راجا ٹوڈر مل نے بادشاہ کے مزاج میں دخیل ہو کر خانخاناں کو معزول کرا دیا۔ بعض کہتے ہیں کہ بددل ہو کر خود ہی چھوڑ گیا۔ چند امراء کو تو راجہ ٹوڈر مل نے ملک بدر بھی کرا دیا۔ راجہ ٹوڈر مل حساب کتاب اور جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔ اس کے عہد میں ملک نے

اقتصادی طور پر بڑی ترقی کی۔ بادشاہ کے عزیز اس کے سایۂ عاطفت میں دیکھتے دیکھتے مالامال ہو گئے۔ جو چیز قبل ازاں ایک روپیہ میں ملتی تھی، راجہ ٹوڈرمل کی خوش تدبیری کے باعث بازار میں چار روپیہ میں ہر جگہ آسانی سے دستیاب ہونے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کا معیارِ زندگی بڑھتا چلا گیا، سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

اکبر نے ٹوڈرمل کو منصب پنج ہزاری دے رکھا تھا لیکن وہ موقع مناسب دیکھ کر دوبارہ سام گڑھ چلا گیا۔ راجاتے راجگان نے اس کی خدمت کے اعتراف میں اُسے عہدۂ بست ہزاروی سے سرفراز کیا۔

خانخاناں

خانخاناں کہ خطاب ذوالفقار الدولہ کا رکھتا تھا، اکبر کا سب سے کم عمر وزیر تھا۔ ذہین اور خوش تقریر۔ اکبر اُسے بہت عزیز رکھنے لگا اور باہر کی ولایتوں سے ہر طرح کی معاملت اس کے سپرد کر رکھی تھی۔ ٹوڈرمل کو یہ بات پسند نہ آئی کیونکہ خانخاناں کا میلان مہاراجہ سام گڑھ کی بجائے فغفورِ چین کی طرف زیادہ تھا۔ آخر نورتنوں کے حلقے سے نکلوا کر دم لیا۔ کہتے ہیں کہ پانی پت کی دوسری لڑائی کے سلسلے میں بھی بادشاہ سے خانخاناں کے اختلافات ہو گئے تھے۔ اکبر ہیموں بقال سے صلح پر آمادہ تھا، خانخاناں اس کا مخالف تھا۔ خانخاناں کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ امراء بڑی بڑی جاگیروں پر قابض ہوں یا علمائ جائدادیں بنائیں۔ اس لئے دربار کے علماء بھی اس سے ناراض ہو گئے تھے اور اس کے عقائد میں نقص نکالنے لگے تھے۔

خانخانان نے بددل ہو کر پرچمِ بغاوت بلند کیا تو لاکھوں لوگ اس سے آملے لیکن ان میں رؤسا اور خاندانی امیر بہت کم تھے، زیادہ تر عام طبقے کے آدمی تھے۔ خانخاناں

اپنا دربار پیپل کے ایک درخت کے نیچے لگاتا تھا۔ اس لئے اس کے حامی بھی پیپل والے مشہور ہوئے۔

ابُوالفضل

اکبر کا یہ مشیر باتدبیر صحیح معنوں میں رتن تھا۔ بحرِ علم کا گوہر یکتا۔ رموز مملکت کے علاوہ ادب و انشا میں بھی دستگاہ کامل رکھتا تھا۔ کہتے ہیں بادشاہ کو دینِ الٰہی کے راستے پر یہی لایا۔ پرچہ نویسوں کو یہ ہدایت تھی کہ کوئی بات بادشاہ کے خلاف نہ لکھیں ہاں تعریف کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ دسویں سن جلوس کے دھوم دھامی جشن مہتابی کا سہرا بھی مورخین ابوالفضل ہی کے سر باندھتے ہیں۔ اسی نے بادشاہ سے اس کی تزک لکھوائی جس کی دھوم فرنگستان سے جاپان تک ہوئی۔ ملاّ عبدالقادر بدایونی کا کہنا ہے کہ ابوالفضل نے خود لکھ کر دی، بادشاہ کو کہاں لکھنا آتا تھا۔ واللہ اعلم

فیضی، بیربل اور مخدوم الملک وغیرہ

نورتنوں میں اور بھی کئی باکمال تھے مثلاً فیضی کہ دربار میں ملک الشعرا تھا۔ اگر کوئی بادشاہ سے ذرا سی بھی سرتابی کرتا تھا تو یہ اس کو بے نقط سناتا تھا۔ بہت سے لوگ اس کے بے نُقط کلام کی وجہ سے بادشاہ کے اور خلاف ہو گئے۔

بیان الدولہ لطائف الملک راجہ بیربل کا ذکر بھی ضرور ہے یہ بھاٹوں کے چودھری تھے۔ ایک بیان دے دیتے تھے۔ لوگ بہت دن اس پر ہنستے رہتے تھے۔

اکبر کے ایک نورتن مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری تھے۔ مخدوم الملک اچھے اچھے خواب دیکھ کر بادشاہ کو بشارتیں دیا کرتے تھے۔ مشائخ کا ایک حلقہ بھی بنا رکھا تھا

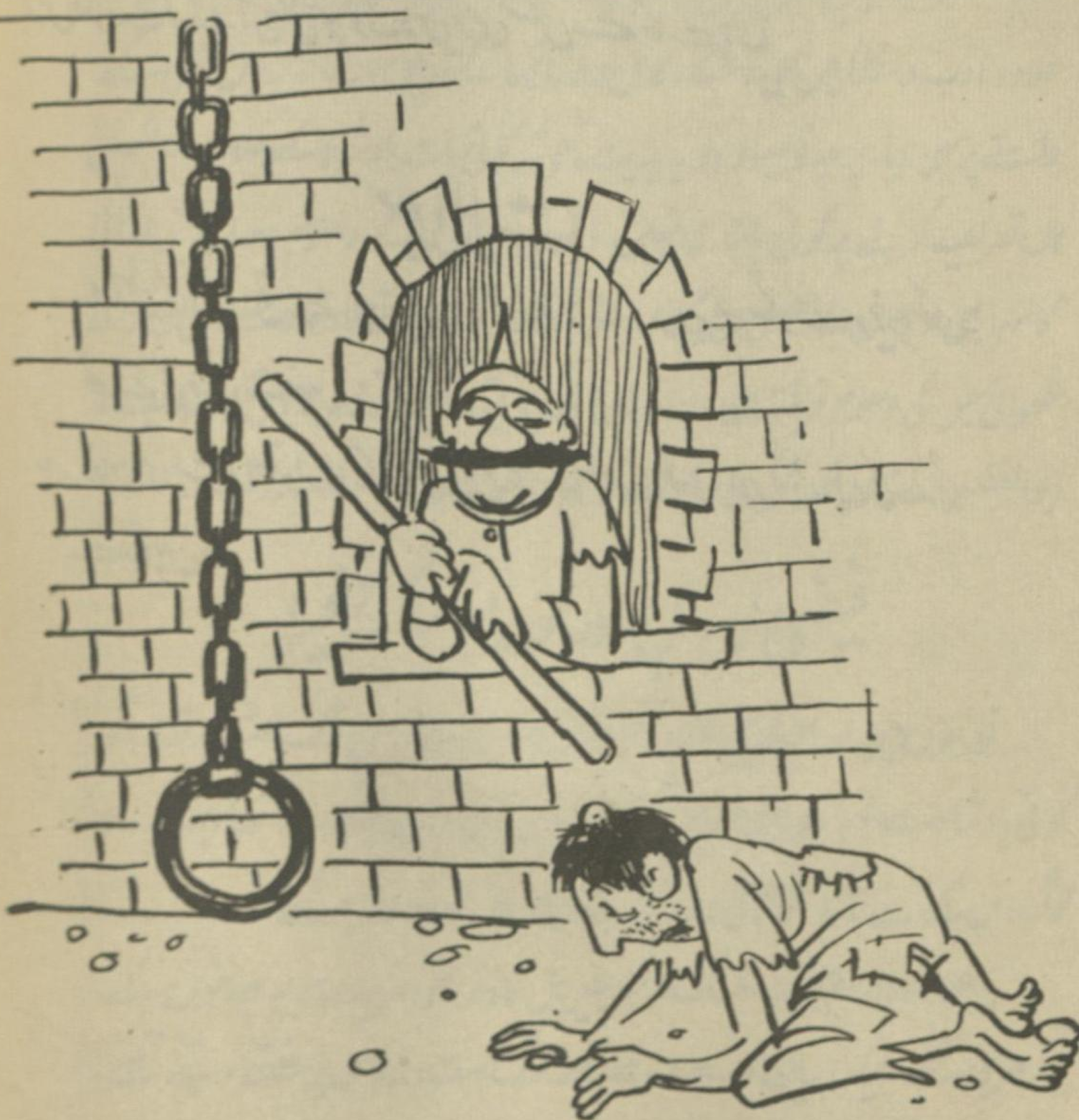
جو چلّے کاٹ کاٹ کر بادشاہ کی درازیِ حکومت کے لئے دعائیں کرتے تھے۔ افسوس موسم کی خرابی کی وجہ سے اکثر دعائیں اوپر بابِ قبول تک نہ پہنچ پاتی تھیں۔ راستے ہی سے لوٹ آتی تھیں۔

اسے اکبر کا کمال جاننا چاہیئے کہ ایسے نورتنوں اور باکمالوں کے باوصف پچاس برس حکومت کر گیا۔ آج کل تو لوگ دس برس مشکل سے نکالتے ہیں۔

سوالات

۱۔ سام گڑھ کہاں واقع ہے۔ اس کے راجہ کا نام، پتہ، ولدیت سکونت وغیرہ لکھو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں؟

۲۔ وفاداری بشرطِ استواری کے موضوع پر جواب مضمون لکھو، اور ٹوڈرمل کی زندگی سے مثالیں دو۔



خو سے زنجیر کھینچتا ہے؟ تمہارے باپ کا زنجیر ہے؟

جہانگیر اور بے بی نورجہاں

اکبر کے بعد جہانگیر تخت پر بیٹھا۔ وہ اکبر کا بیٹا تھا۔ اگر اس کا باپ ہوتا یقیناً اس سے پہلے تخت پر بیٹھتا۔

جن لوگوں نے سہراب مودی کی فلم پکار دیکھی ہے، ان کے لئے جہانگیر کی ذات اور کارنامے محتاج تعارف نہ ہوں گے اس کی بیوی نورجہاں تھی جو ملکہ ترنم تو نہ تھی، لیکن بعض اور کمالات رکھتی تھی۔ ابھی تو عمر ہی تھی کہ لوگوں کے کبوتر پکڑ کر اڑا دیا کرتی تھی خصوصاً ولی عہدوں وغیرہ کے۔ بعد میں ایسی زور دار ملکہ ثابت ہوئی کہ بڑے بڑوں کے ہاتھوں کے طوطے اُسے دیکھتے ہی اُڑ جایا کرتے تھے۔ جہانگیر کو بڑا ہی زیرک اور سمجھ دار جاننا چاہیئے کہ اس نے محض کبوتروں کے اُڑانے سے نورجہاں کی لیاقت کا اندازہ کر کے اس سے شادی کر لی تھی اس کے سلیقہ شعار، پابند صوم وصلوٰۃ یا کشیدہ کاری کا ماہر وغیرہ ہونے کی شرط نہ رکھی تھی۔

جہانگیر کی بیوی کے علاوہ اس کا عدل بھی مشہور ہے۔ اس نے محل کے باہر ایک زنجیر اور زنجیر سے ایک گھنٹہ لٹکا رکھا تھا۔ پاس ہی دربان بٹھا دیئے تھے کہ کوئی فریادی نزدیک آنے کی کوشش کرے تو اس کے ڈنڈا رسید کریں۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی شخص گھنٹہ بجانے میں کامیاب ہو جاتا تھا اور بادشاہ کو بے وقت جگاتا تھا۔ اس کی سزا بھی پاتا ہوگا۔

جہانگیر کا عدل اس کے زمانے کے حساب سے تھا۔ نظامِ عدل میں ایسی ترقیاں بعد کو انگریز کے زمانے میں ہوئیں کہ مقدمہ چلتا ہے تو برسوں چلتا ہے۔ فیصلہ ہونے تک فریقین اگر زندہ ہوں، تو یہ بھی بھول چکے ہوتے ہیں کہ جھگڑا کس بات کا تھا۔ زنجیر اور گھنٹے والا نظام آج رائج کیا جائے تو یہ خطرہ ہے کہ لوگ یہ چیزیں ہی چرالے جائیں گے، بیچ کھائیں گے۔

جہانگیر نے فتوحات زیادہ نہیں کیں۔ بس بیٹھا تزک لکھتا رہتا تھا۔ انصاف کرتا رہتا تھا۔ شراب پیتا رہتا تھا اور نورجہاں سے محبت کرتا رہتا تھا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

مورخین کی یہ عادت ہے کہ غلط باتیں لکھتے رہتے ہیں۔ ایک بات یہ لکھ دی کہ جہانگیر نے شیر افگن کو جو نورجہاں کا پہلا شوہر تھا مروا دیا تھا تاکہ اس سے شادی کر سکے۔ یہ غلط ہے۔ جہانگیر نے تو اسے بہت مرنے سے روکا لیکن وہ مر ہی گیا۔

اکبر کے باب میں بھی ہم مورخین کی ایک غلط بیانی کی تردید کرنا بھول گئے تھے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ اکبر نے چتوڑ فتح کیا تو تیس ہزار آدمی تیغ کے گھاٹ اتار دیئے۔ یہ صحیح نہیں۔ اکبر ہرگز ایسا سفاک نہ تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے مقتولین کی تعداد آٹھ ہزار اور فرشتہ نے دس ہزار لکھی ہے۔ اسی کو صحیح جاننا چاہیئے۔

سوالات

۱۔ کیا کوئی بھی لڑکی کبوتر اڑا دیتی تو جہانگیر اس سے شادی کر لیتا۔

۲۔ جہانگیر اکبر کے بعد کیوں تخت پر بیٹھا۔ بلکہ تخت پر بیٹھا ہی کیوں ؟

۱۴؍ اپریل ۱۹۷۰ء

شاہجہاں اور تاج محل

شاہ جہاں جہانگیر کا بیٹا اور اکبر کا پوتا تھا۔ کسی معمار یا عمارتی ٹھیکیدار کا نورِ نظر نہ تھا، نہ کسی پی ڈبلیو ڈی والے کا مورثِ اعلیٰ تھا جیسا کہ لوگ اسے اتنی ساری عمارتیں بنانے کی وجہ سے سمجھ لیتے ہیں۔

تاج محل اس کی بنائی ہوئی عمارتوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کی تعمیر میں بارہ سال لگے اور کروڑوں روپے صرف ہوئے۔ حضرت قائدِ اعظم کے مزار کی تعمیر میں بھی اتنے ہی پیسے اور اتنے ہی برس لگے۔ اگر کوئی فرق ان دونوں مقبروں کی خوبصورتی اور تعمیر میں ہے تو اس کی وجہ ظاہر ہے۔ شاہجہاں کے زمانے تک فنِ تعمیر اور نقشہ سازی میں اتنی ترقیاں نہ ہوئی تھیں۔ پتھر وغیرہ ڈھونے، گھسنے چمکانے وغیرہ کے طریقے بھی پرانے اور دیر طلب تھے۔ مشینی گاڑیاں اور بجلی کی سریع الرفتار مشینیں بھی ایجاد نہ ہوئی تھیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ قائدِ اعظم کروڑوں آدمیوں کے محبوب تھے جبکہ ممتاز محل صرف ایک شخص کی محبوبہ تھی۔ بایں ہمہ اس زمانے کے اعتبار سے ہم تاج محل کو بہت اچھی عمارت کہہ سکتے ہیں۔

شاہجہاں بہت دُور کی نظر رکھتا تھا۔ تاج محل نہ ہوتا تو آج بھارت کی ٹورسٹ ٹریڈ کو اتنی ترقی نہ ہوتی۔ اتنا زرِ مبادلہ نہ حاصل ہوتا۔ اس کے دیگر نتائج بھی دُور رس ہیں۔ تاج محل نہ ہوتا تو تاج محل بیڑی بھی نہ ہوتی۔ تاج محل چپل بھی نہ ہوتی، تاج محل لٹھن نہ

ہوتا جو صحت بخش اجزا کا مرکب ہے اور جسے تیاری کے دوران میں ہاتھوں سے نہیں چھوا جاتا۔ حتیٰ کہ کپڑے دھونے کی خاطر تاج محل صابن بھی نہ ہوتا۔ یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ تاج محل نہ ہوتا تو لوگ کیلنڈروں پر تصویریں کس چیز کی چھاپتے؟

شاہجہاں نے کئی مسجدیں بھی بنائیں، موتی مسجد اور دلی کی جامع مسجد وغیرہ۔ لال قلعہ بھی بنایا، بہادر شاہ ظفر اسی میں مشاعرہ وغیرہ کرایا کرتے تھے تخت طاؤس بھی شاہجہاں ہی نے بنایا تھا، اس میں اپنی طرف سے بہت ہیرے جواہر وغیرہ جڑے تھے۔ لیکن اس کے جانشینوں کو پسند نہیں آیا، محمد شاہ نے اُسے اٹھا کر نادر شاہ گڈریے کو دے دیا۔ وہ ایران لے گیا۔ اور اس کا کھوپرا کھا لیا۔

شاہجہاں کا زمانہ امن کا زمانہ تھا پھر بھی اس نے چند فتوحات کر ہی ڈالیں۔ تاریخوں والے لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں چوری چکاری بھی نہ ہوتی تھی۔ رشوت خوری بھی نہ تھی خدا جانے اس زمانے کے اہل کار کیا کھاتے ہوں گے۔

جہانگیر کا مقبرہ بھی شاہجہاں نے بنایا تھا۔ یہ قیاس کرنا غلط ہے کہ شیر افگن نے بنوایا ہو گا۔

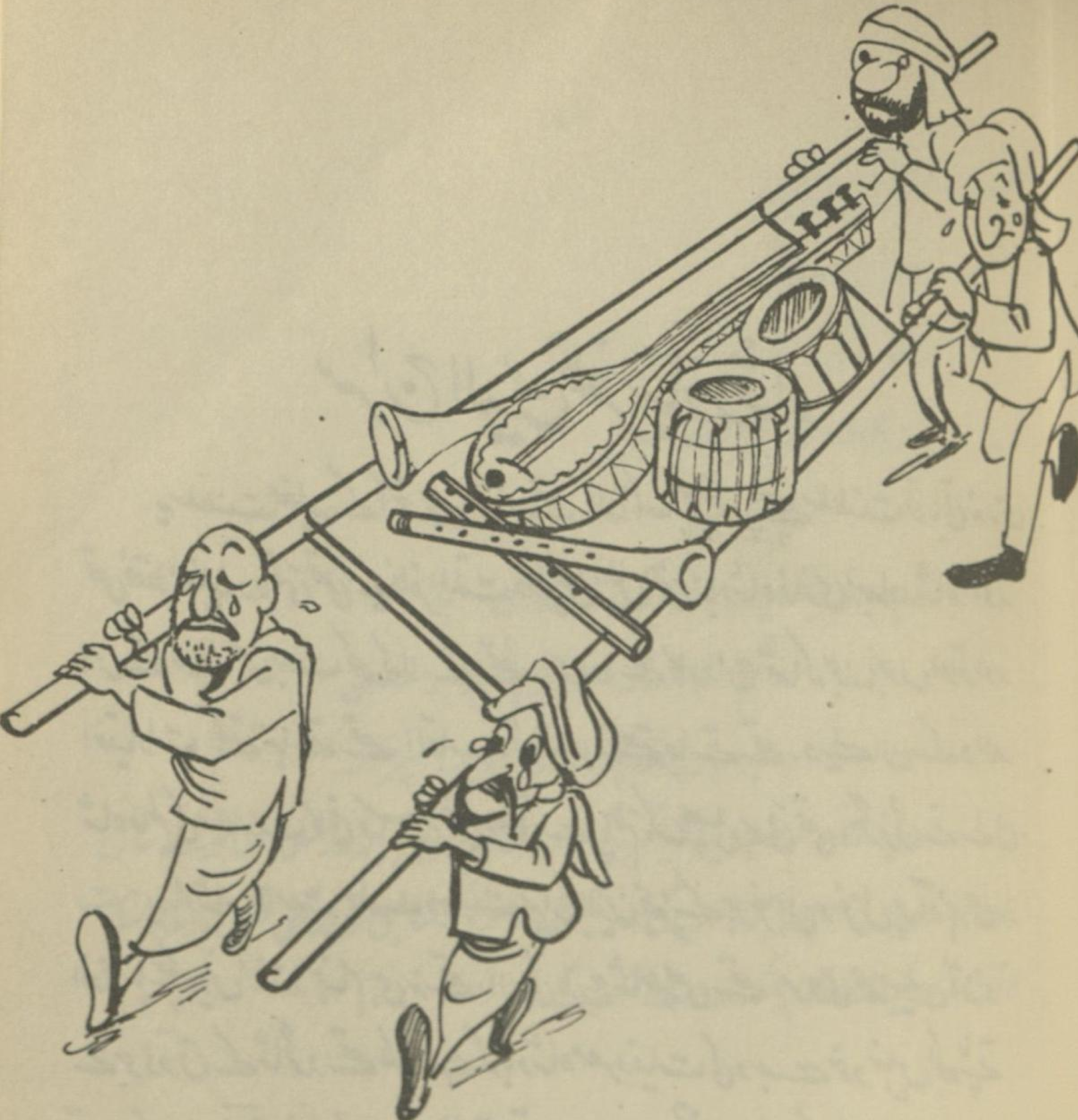
۱۶ر اپریل ۱۹۷۰ء

عالمگیر بادشاہ

شاہ اورنگ زیب عالمگیر بہت لائق اور متدین بادشاہ تھا۔ دین اور دنیا دونو پر نظر رکھتا تھا۔ اس نے کبھی کوئی نماز قضا نہ کی' اور کسی بھائی کو زندہ نہ چھوڑا۔ بعض لوگ اعتراض بھی کرتے ہیں، موخرالذکر بات پر، حالانکہ یہ ضروری تھا۔ اس کے سب بھائی نالائق تھے جیسے کہ ہر بادشاہ کے بھائی ہوتے ہیں۔ نالائق نہ ہوں تو خود پہل کر کے بادشاہ کو قتل نہ کر دیں؟

بعض ہندو مورخین نے عالمگیر کے متعلق بہت غلط بیانیاں کی ہیں مثلاً یہی کہ وہ متعصب تھا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر متعصب ہوتا تو جو سلوک اپنے بھائیوں سے کیا وہ ہندو راجاؤں وغیرہ سے کرتا۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس نے کئی مندروں کو جاگیریں دے رکھی تھیں متعصب ہوتا تو یہی جاگیریں مسجدوں کو دیتا۔ یہ بات بھی اس کی بے تعصبی کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے کہ اس نے ہزاروں میل دور دکن جا کر ابوالحسن تاناشاہ کی سرکوبی کی' حالانکہ وہ دلی کی سلطنت کا خواہاں نہ تھا اور مسلمان بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں شیواجی کو بلا کر دربار میں پنج ہزاری منصب دیا۔ بیشک وہ بھاگ گیا اور باغی ہو گیا، لیکن یہ اس کا فعل ہے۔

عالمگیر کی نیک نفسی کے ثبوت میں اتنا لکھنا کافی ہے کہ مغلوں میں یہ واحد بادشاہ ہے کہ رحمۃ اللہ علیہ کہلاتا ہے جتنی کتابیں اس کی صفائی میں لکھی گئی ہیں کسی اور بادشاہ



کی صفائی میں نہیں لکھی گئیں ۔ شراب نہ پیتا تھا ، نہ پینے دیتا تھا ۔ گانا نہ سنتا تھا نہ سننے دیتا تھا ۔ تاریخوں میں آیا ہے کہ لوگوں نے ایک جنازہ تیار کیا اور لے چلے ۔ بادشاہ نے پوچھا یہ کس کا جنازہ ہے ۔ لوگوں نے کہا : موسیقی کا ۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ۔ اس کو اتنا گہرا دفن کرنا کہ پھر نہ نکل سکے ۔ کبھی کبھی پکا گانا سنتے ہوتے یا فلمی موسیقی پر سر دھنتے ہوئے ہم سوچتے ہیں کہ کاش لوگوں نے اس دانش مند بادشاہ کی اس بات پر عمل کیا ہوتا یعنی ذرا زیادہ گہرا دفن کیا ہوتا ۔

سراج الدین ظفر بہادر شاہ

یہ سلطنت مغلیہ کے آخری بادشاہ تھے۔ ان تک پہنچتے پہنچتے سلطنت تو باقی نہ رہی تھی فقط مغلیہ رہ گئی تھی۔ یہ ظفر الملت والدین، ظلِ الٰہی، بادشاہ غازی، بہادر شاہ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہلاتے تھے۔ اس زمانے کا رواج تھا کہ جوں جوں علاقہ اور اختیارات گھٹتے جاتے تھے۔ القاب و آداب بڑھتے جاتے تھے۔ ویسے ان کے والد شاہ عالم کی سلطنت کافی وسیع تھی۔ دلی سے پالم تک پھیلی ہوئی تھی انگریزوں نے لے لی۔

یہ بادشاہ سلامت ہمارے دوست سراج الدین ظفر کے جو غزال و غزل پر آدم جی انعام پا چکے ہیں، فقط ہمنام ہی نہ تھے۔ ان کی طرح شاعر بھی تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے جو ذوقؔ کے شاگرد تھے لکھا ہے کہ بادشاہ مصروفیات کی وجہ سے خود نہیں لکھ پاتے تھے۔ اُستاد ذوقؔ غزل کا مسودہ بناتے تھے۔ یہ اس میں تخلص ڈال کر اپنے نام سے پڑھ دیتے تھے۔ اگر یہ سچ ہے تو استاد ذوقؔ بہت ایثار پیشہ آدمی تھے اچھے اچھے شعر چن کر بادشاہ کو دے دیتے تھے۔ بُرے بُرے اپنے دیوان میں شامل کرنے کے لئے رکھ لیتے تھے۔

غالبؔ بھی انہی بادشاہ سلامت کے دربار سے وابستہ تھے۔ وظیفہ پاتے تھے اور دُعا دیتے تھے۔ مصاحبی کرتے تھے اور اِتراتے تھے۔ ورنہ شہر میں ان کی کچھ آبرو نہ تھی۔ ننگے پھرا کرتے تھے اور اُدھار کھاتے تھے۔ دکانداروں نے انہی کے زمانے میں

تختیاں لگانی شروع کیں۔

"ادھار بند ہے"۔

"ادھار مانگ کر شرمندہ نہ کریں"۔

قرض محبت کی قینچی ہے وغیرہ

غالب نے ایک بار بادشاہ کو دعا دی تھی ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

انھوں نے یہ حساب نہ لگایا کہ یہ تو ایک لاکھ تیس ہزار دو سو اٹھانوے سال بن جاتے ہیں۔ اچھا ہوا ان کی دعا قبول نہ ہوئی۔ شاہی تو لد گئی تھی۔ بادشاہ سلامت اتنے دن کیا کرتے؟ کہاں سے کھاتے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ

مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب کے مہاراجا تھے اور اُن کا نام رنجیت سنگھ تھا۔ اسی لئے ان کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کہتے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انصاف مشہور ہے۔ ویسے تو ہندوستان کے سبھی راجاؤں کا انصاف مشہور ہے لیکن یہ واقعی سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے۔ سزا دینے میں مجُرم اور غیر مجرم کی تخصیص نہ برتتے تھے جو شخص کوئی جرم نہ کرے وہ بھی پکڑا آتا تھا۔ فرماتے تھے علاج سے پرہیز بہتر ہے۔ اس وقت اس شخص کو سزا نہ ملتی تو آگے چل کر ضرور کوئی جُرم کرتا۔

بعد کے حکمرانوں نے انہی کی تقلید میں جرم نہ کرنے والے کو حفظ ماتقدم کے طور پر سزا دینے اور جیل بھیجنے کا اصول اختیار کیا۔ کبھی مجُرم کو بھی سزا دیتے ہیں اگر وہ ہاتھ آجاتے اور اس کا وکیل اچھا نہ ہو تو —— !

ٹھگی کا اِنسداد کیسے ہُوا

جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس زمانے میں ملک میں ٹھگی بہت ہو گئی تھی۔ ٹھگ لوگوں کو راہ چلتے لوٹ لیتے تھے۔ آخر والیِ ملک نے محکمہ انسدادِ ٹھگی قائم کیا اور یہ قانون بنایا کہ سب عمّال اور اہل کار لوٹ کے مال میں سے حصّہ وصول کیا کریں۔ لوگوں کی ہچکچاہٹ دُور کرنے اور حوصلہ بڑھانے کے لئے والی نے خود حصہ لینا شروع کر دیا۔ ٹھگوں نے جب یہ دیکھا کہ ہمارے پاس تو کچھ بچتا ہی نہیں بلکہ پلّے سے دینے کی نوبت آگئی ہے تو ٹھگی سے توبہ کی اور رفتہ رفتہ اس کا بالکل انسداد ہو گیا۔

ایک سبق گرامر کا

لفظوں کے اُلٹ پھیر کے علم کو گرامر کہتے ہیں۔ لفظوں کا مجموعہ جُملہ کہلاتا ہے۔ یہ مجموعہ زیادہ بڑا اور لمبا ہو جائے تو اُسے میر جملہ کہتے ہیں۔

اب چونکہ جملے بازی اور فقرے بازی لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اس لئے گرامر کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہو گئی ہے۔

شاعری کی گرامر کو عروض کہتے ہیں۔

پُرانے لوگ عروض کے بغیر شاعری نہیں کیا کرتے تھے۔ آج کل کسی شاعر کے سامنے عروض کا نام لیجئے تو پوچھتا ہے وہ کیا چیز ہوتی ہے۔ ہم نے ایک شاعر کے سامنے زحافات کا نام لیا۔ بولے: خرافات؟ مجھے خرافات پسند نہیں۔ بس میری غزل سنیئے اور جایئے۔

عروض میں بحریں ہوتی ہیں جن میں بعض بہت گہری ہوتی ہیں۔ نومشق ان میں اکثر ڈوب جاتے ہیں۔ اسی لئے احتیاط پسند لوگ شاعری اور عروض کے پاس نہیں جاتے۔ عمر بھر نثر لکھتے رہتے ہیں۔

لفظ اور صیغے

پرانے زمانے میں تذکیر و تانیث کے قاعدے مقرر تھے۔ قاعدہ یاد نہ ہو تو

لباس اور بالوں وغیرہ سے پہچان ہو جاتی تھی۔ اب مخاطب سے پوچھنا پڑتا ہے کہ تو مذکر ہے یا مؤنث ہے اور بتا تیری رضا کیا ہے؟ اس کے بعد اس سے صحیح صیغے میں گفتگو کرتے ہیں یا ایران ہو تو اس کے ساتھ صیغہ کرتے ہیں۔

بہت سے واحد ایک جگہ اکٹھے ہوں تو جمع کے صیغے میں آجاتے ہیں۔ جمع کے صیغے میں تھوڑی احتیاط ضروری ہے خصوصاً جن دنوں شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگی ہوتی ہو۔ ان دنوں جمع نہیں ہونا چاہیئے۔ واحد رہنا ہی اچھا ہے۔

فعل ماضی

ماضی میں کسی شخص نے جو فعل کیا ہو اُسے فعل ماضی کہتے ہیں۔ کرنے والا عموماً اسے بھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن لوگ نہیں بھولتے۔

ماضی کی کئی قسمیں مشہور ہیں۔ سب سے مشہور "شاندار ماضی" ہے۔ جس قوم کو اپنا مستقبل ٹھیک نظر نہ آئے وہ اس صیغے کو بہت استعمال کرتی ہے۔

ایک ماضی شکیہ ہے۔ جن لوگوں کا ماضی مشکوک ہو وہ ماضی شکیہ کی ذیل میں آتے ہیں۔ عموماً ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔

ماضی شرطی یا ماضی تمنائی۔ جن لوگوں نے ریس میں یا تاش پر شرطیں بد بد کر اپنا ماضی تباہ کیا ہو اُن کی ماضی کو شرطی کہتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کی تمنا ہوتی ہے کہ اور پیسے آئیں تو ان کو بھی ریس میں لگائیں اس لیے شرطی اور تمنائی دونوں ماضیاں ساتھ ساتھ آتی ہیں۔

ماضی کی دو اور قسمیں ماضی قریب اور ماضی بعید ہیں یا ضی کو حتی الوسع قریب نہ

آنے دینا چاہیئے۔ جتنی بعید رہے گی اور جتنے اس پر پردے پڑے رہیں گے، اتنی ہی بھلی معلوم ہو گی۔ ماضی کا بعید رہنا مستقبل کے لئے بھی اچھا ہے۔

فعل مستقبل

جو لوگ آج کا کام ہمیشہ کل پر ٹالتے ہوں ان کے ہر فعل کو فعل مستقبل کہا جاتا ہے۔ میں یہ کروں گا، میں وہ کروں گا، فعل مستقبل ہی کی مثالیں ہیں۔ الیکشن وغیرہ کے دنوں میں ساری گفتگو عموماً فعل مستقبل کے صیغوں ہی میں ہوتی ہے۔

فعل کی دیگر قسمیں

فعل کی بنیادی قسمیں دو ہیں۔ جائز فعل، ناجائز فعل۔ ہم صرف جائز قسم کے افعال سے بحث کریں گے کیونکہ قسم دوئم پر پنڈٹ کوکا آنجہانی اور جناب جوش ملیح آبادی مبسوط کتابیں لکھ چکے ہیں۔

فعل کی دو قسمیں فعل لازم اور فعل متعدی بھی ہیں۔ فعل لازم وہ ہے جو کرنا لازم ہو۔ مثلاً افسر کی خوشامد، حکومت سے ڈرنا۔ بیوی سے جھوٹ بولنا وغیرہ۔

فعل متعدی عموماً متعدی امراض کی طرح پھیل جاتا ہے۔ ایک شخص کنبہ پروری کرتا ہے۔ دوسرے بھی کرتے ہیں۔ ایک رشوت لیتا ہے۔ دوسرے اس سے بڑھ کر لیتے ہیں۔ ایک بناسپتی گھی کا ڈبہ پچیس روپے میں کر دیتا ہے دوسرا گوشت کے ساڑھے بارہ روپے لگاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ دونوں اپنے فعل متعدی کو فعل لازم قرار دیتے ہیں۔ ان افعال میں گھاٹے میں صرف مفعول رہتا ہے یعنی عوام۔ فاعل کی

شکایت کی جائے تو وہ فائل میں دب جاتی ہے ۔

فعلِ حال

یہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے اچھا حال اور بُرا حال ۔ بیمار کا حال عموماً بُرا حال ہوتا ہے لیکن اُن کے دیکھے سے جو منہ پر رونق آجاتی ہے تو وہ سمجھتا ہے اچھا ہے ۔

"اُن" حرفِ اشارہ ہے ۔ یہ اشارہ محبوب کی طرف ہے ۔ عزیز طالب علمو! تم اپنے محبوب کی طرف یا محبوب سے اشارہ کر سکتے ہو، لیکن اپنی ذمہ داری پر ۔

۱۴ر فروری ۱۹۷۱ء

ریاضی کے قاعدے

ابتدائی حساب

حساب کے چار بڑے قاعدے ہیں :

جمع ، تفریق ، ضرب ، تقسیم

پہلا قاعدہ : جمع

جمع کے قاعدے پر عمل کرنا آسان نہیں۔
خصوصاً مہنگائی کے دنوں میں
سب کچھ خرچ ہو جاتا ہے
کچھ جمع نہیں ہو پاتا۔
جمع کا قاعدہ مختلف لوگوں کے لئے مختلف ہے۔
عام لوگوں کے لئے ۱ + ۱ = $1\frac{1}{2}$
کیونکہ $\frac{1}{2}$ انکم ٹیکس والے لے جاتے ہیں
تجارت کے قاعدے سے جمع کریں تو ۱ + ۱ کا مطلب ہے گیارہ۔
رشوت کے قاعدے سے حاصل جمع اور زیادہ ہو جاتا ہے۔
قاعدہ وہی اچھا جس میں حاصل جمع زیادہ سے زیادہ آئے بشرطیکہ پولیس مانع نہ ہو۔



ایک قاعدہ زبانی جمع خرچ کا ہوتا ہے
یہ ملک کے مسائل حل کرنے کے کام آتا ہے
آزمودہ ہے۔

تفریق

میں سندھی ہوں، تو سندھی نہیں ہے
میں بنگالی ہوں، تو بنگالی نہیں ہے
میں مسلمان ہوں، تو مسلمان نہیں ہے
اس کو تفریق پیدا کرنا کہتے ہیں
حساب کا یہ قاعدہ بھی قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے

تفریق کا ایک مطلب ہے، منہا کرنا
یعنی نکالنا ایک عدد میں سے دوسرے عدد کو
بعض عدد از خود نکل جاتے ہیں

بعضوں کو زبردستی نکالنا پڑتا ہے
ڈنڈے مار کر نکالنا پڑتا ہے
فتوے دے کر نکالنا پڑتا ہے

ایک بات یاد رکھیئے
جو لوگ زیادہ جمع کر لیتے ہیں
وہی زیادہ تفریق بھی کرتے ہیں
انسانوں اور انسانوں میں
مسلمانوں اور مسلمانوں میں

عام لوگ تفریق کے قاعدے کو پسند نہیں کرتے
کیونکہ حاصل تفریق کچھ نہیں آتا
آدمی ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔



ضرب

تیسرا قاعدہ ضرب کا ہے
ضرب کی کئی قسمیں ہیں
مثلاً ضربِ خفیف۔ ضرب شدید، ضرب کاری وغیرہ
ضرب کی ایک اور تقسیم بھی ہے۔
پتھر کی ضرب، لاٹھی کی ضرب، بندوق کی ضرب
علامہ اقبال کی ضربِ کلیم ان کے علاوہ ہے

حاصلِ ضرب کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ضرب کس چیز سے دی گئی ہے یا لگائی گئی ہے۔
آدمی کو آدمی سے ضرب دیں تو حاصل ضرب بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔
لیکن ضروری نہیں کہ وہ زندہ ہو
ضرب کے قاعدے سے کوئی سوال حل کرنے سے پہلے تعزیراتِ پاکستان پڑھ لینی چاہیئے۔

تقسیم

یہ حساب کا بڑا ضروری قاعدہ ہے۔ سب سے زیادہ جھگڑے اسی پر ہوتے ہیں۔
تقسیم کا مطلب ہے بانٹنا
اندھوں کا آپس میں ریوڑیاں بانٹنا



بندر کا بلیوں میں روٹی بانٹنا
چوروں کا آپس میں مال بانٹنا
اہلکاروں کا آپس میں رشوت بانٹنا

مل بانٹ کر کھانا اچھا ہوتا ہے
دال تک جوتوں میں بانٹ کر کھانی چاہیئے
ورنہ قبض کرتی ہے

تقسیم کا طریقہ کچھ مشکل نہیں ہے
حقوق اپنے پاس رکھیئے
فرائض دوسروں میں بانٹ دیجئے
روپیہ پیسہ اپنے کیسے میں ڈالیئے
قناعت کی تلقین دوسروں کو کیجئے

آپ کو مکمل پہاڑہ مع گر یاد ہو
تو کسی کو تقسیم کی کانوں کان خبر نہیں ہو سکتی۔ آخر کو ۱۲ کروڑ کی دولت کو
۲۲ خاندانوں نے آپس میں تقسیم کیا ہی ہے ؟
کسی کو پتہ چلا ؟

سوالات

۱۔ تفریق کے قاعدے سے دودھ میں سے مکھی نکالو۔
۲۔ آدمی ضربِ مسلسل کی تاب کہاں تک لا سکتا ہے ؟
۳۔ جو اندھے نہیں، وہ بھی ریوڑیاں اپنوں ہی میں کیوں بانٹتے ہیں ؟

۳۰ مارچ ۱۹۷۰ء

ابتدائی الجبرا

یہ بھی ایک قسم کا حساب ہے۔ چونکہ طالب علم اس سے گھبراتے ہیں اور یہ جبراً پڑھایا جاتا ہے۔ اس لئے الجبرا کہلاتا ہے

حساب اعداد کا کھیل ہے، الجبرا حرفوں کا۔ ان میں سب سے مشہور حرف "لا" ہے۔ جسے لا لکھتے ہیں۔ اس کے کچھ معنی نہیں بلکہ یہ ایسا ہے — کہ کسی اور لفظ کے ساتھ لگ جائے تو اس کے معنی بھی سلب کر لیتا ہے جس طرح لامکاں۔ لا دوا لاولد وغیرہ۔ بعض مستثنیات بھی ہیں۔ مثلاً لاہور۔ لاڑکانہ۔ لالٹین۔ لالوکھیت وغیرہ۔ اگر ان لفظوں کے ساتھ لا نہ ہو، تو ہور۔ ڑکانہ، لٹین اور لوکھیت کے کچھ معنی نہ نکلیں۔

آزمائے کو آزمانا جہل کہتے ہیں، لیکن الجبرا میں آزمائے کو ہی آزماتے ہیں۔ اچھے خاصے پڑھے لکھوں کو نئے سرے سے ا ب ج سکھاتے ہیں بلکہ ان کے مربعے بھی نکلواتے ہیں۔

الجبرا کا ہماری طالب علمی کے زمانے میں کوئی خاص مصرف نہ تھا اس سے صرف اسکولوں کے طلبہ کو فیل کرنے کا کام لیا جاتا تھا لیکن آج کل یہ عملی زندگی میں خاصا استعمال ہوتا ہے۔ دکاندار اور گداگر اس قاعدے کو زیادہ استعمال کرتے ہیں۔



پیسہ لا اور لا۔ اور لا

بعض رشتوں میں الجبرا یعنی جبر کا شائبہ ہوتا ہے، جیسے مدر اِن لا، فادر اِن لا وغیرہ۔
مارشل لا کو بھی الجبرے ہی کا ایک قاعدہ سمجھنا چاہیئے۔

سوالات

۱۔ لا کا مربہ ڈالو۔ بوتل میں ڈالو گے یا مرتبان میں؟

۲۔ لالا لاچند کو لا سے تقسیم کرو۔

ابتدائی جیومیٹری

جیومیٹری لکیروں کا کھیل ہے۔ علمائے جیومیٹری کو ہم لکیر کے فقیر کہہ سکتے ہیں۔ دنیا نے اتنی ترقی کر لی۔ ہر چیز بشمول سائنس اور مہنگائی کہاں سے کہاں پہنچ گئی لیکن جیومیٹری والوں کے ہاں اب تک زاویہ قائمہ ۹۰ درجہ کا ہوتا ہے اور مثلث کے اندرونی زاویوں کا مجموعہ ۱۸۰ درجے سے تجاوز نہیں کر پایا۔ امریکہ اور روس اور ہر معاملہ میں لڑتے ہیں اس معاملے میں ملی بھگت ہے۔ ہم اپنے ملک میں اپنی پسند کا نظام لائیں گے تو اپنی اسمبلی میں ایک قانون بنوائیں گے، چند درجے ضرور بڑھائیں گے۔ مستطیل بھی جیسی پرانے زمانے میں چورس ہوتی تھی ویسی آج کل ہے کسی کو یہ توفیق تک نہ ہوئی کہ اس کے چار سے پانچ یا چھ ضلعے کر دے۔ ایک آدھ فالتو رہے تو اچھا ہی ہے۔ مغربی پاکستان کے ضلعوں میں ہم ردّوبدل کرتے رہتے ہیں تو مستطیل وغیرہ کے ضلعوں میں کیوں نہیں کر سکتے؟

جیومیٹری میں بنیادی چیزیں ہیں: خط۔ نقطہ۔ دائرہ۔ مثلث وغیرہ۔ اب ہم تھوڑا تھوڑا حال ان کا لکھتے ہیں۔

خط

خط کی کئی قسمیں ہیں: خطِ مستقیم۔ یہ بالکل سیدھا ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر نقصان

اٹھاتا ہے۔ بیدھے آدمی بھی نقصان اٹھاتے ہیں۔

خطِ منحنی: یہ ٹیڑھا ہوتا ہے بالکل کھیر کی طرح۔ لیکن اس میں میٹھا نہیں ڈالا جاتا۔

خطِ تقدیر: اسے فرشتے پکی سیاہی سے کھینچتے ہیں۔ یہ مستقیم بھی ہوتا ہے۔ منحنی بھی۔ اس کا مٹانا مشکل ہوتا ہے۔

خطِ شکستہ: یہ وہ خط ہے جس میں ڈاکٹر لوگ نسخے لکھتے ہیں۔ تبھی تو آج کل اتنے لوگ بیماریوں سے نہیں مرتے۔ جتنے غلط دواؤں کے استعمال سے مرتے ہیں۔

خطِ استوا: یہ اس لئے ہوتا ہے کہ کہیں تو دنیا میں دن رات برابر ہوں۔ کہیں تو مساوات نظر آتے۔

خط کی دو اور قسمیں مشہور ہیں

ا۔ حسینوں کے خطوط: یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن میں دُور بہت دُور، افق کے پار جانے کا ذکر ہوتا ہے جہاں ظالم سماج نہ پہنچ سکے۔ یہ تصویرِ بتاں کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حسینوں کے چہرے پر ہوتے ہیں اور جن کو چھپانے کے لئے ہر سال کروڑوں روپے کی کریمیں، لوشن پوڈر وغیرہ صرف کئے جاتے ہیں۔

ایک خط پرانے اُردو شعرا کے معشوقوں کے چہرے پر آیا کرتا تھا جس کے بعد عاشق کو یہ دوسری قسم کے خط بلکہ رجسٹری لفافے آنے شروع ہو جاتے تھے کسی شاعر کا شعر ہے:

ع اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا



چل نکل اسلام کے دائرے سے

۲۔ متوازی خطوط : یہ ویسے تو آمنے سامنے ہوتے ہیں لیکن تعلقات نہایت کشیدہ۔ ان کو کتنا بھی لمبا کھینچ کے لے جایئے یہ کبھی آپس میں نہیں ملتے۔ کتابوں میں یہی لکھا ہے، لیکن ہمارے خیال میں ان کو ملانے کی کوئی سنجیدہ کوشش بھی کبھی نہیں کی گئی۔ آج کل بڑے بڑے ناممکنات کو ممکن بنا دیا گیا ہے۔ یہ تو کس شمار قطار میں ہیں۔

نقطہ (۰)

نقطہ یعنی بندی یعنی پوائنٹ۔ یہ محض کسی جگہ کی نشاندہی کے لئے ہوتا ہے۔ جیومیٹری کی کتابوں میں آیا ہے کہ نقطہ جگہ نہیں گھیرتا۔ ایک آدھ نقطے کی حد تک یہ بات صحیح ہوگی لیکن چھ نقطوں سے تو آپ سارا پاکستان گھیر سکتے ہیں۔

دائرہ

دائرے چھوٹے بڑے ہر قسم کے ہوتے ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قریب قریب سبھی گول ہوتے ہیں۔ ایک اور عجیب بات ہے کہ ان میں قطر کی لمبائی ہمیشہ نصف قطر سے دُگنی ہوتی ہے — جیومیٹری میں اس کی کوئی وجہ نہیں لکھی گئی۔ جو کسی نے پُرانے زمانے میں فیصلہ کر دیا۔ اب تک چلا آرہا ہے۔

ایک دائرہ اسلام کا دائرہ کہلاتا ہے۔ پہلے اس میں لوگوں کو داخل کیا کرتے تھے آج کل داخلہ منع ہے۔ صرف خارج کرتے ہیں۔

مثلث

تکون کے تین کونے ہوتے ہیں، چار کونوں والی بھی ہوتی ہوں گی لیکن ہمارے

ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ کم از کم ہماری نظر سے نہیں گزریں۔

مثلثیں کئی طرح کی ہوتی ہیں مثلاً عشق کی مثلث، عاشق محبوب اور رقیب۔ فلم میں بھی یہی مثلث ہوتی ہے لیکن وہاں ان تینوں کو پیسے ملتے ہیں۔ رقابت سے لے کر شادی تک فلم ساز کے خرچ پر ہوتی ہے۔

۶؍اپریل ۱۹۷۰ء

سوالات

۱۔ خط نستعلیق۔ خطِ استوا اور خط وحدانی میں کیا فرق ہے؟
۲۔ مثلث کے چاروں اضلاع برابر کیوں نہیں ہوتے؟
۳۔ سبزۂ خط پر کتنے پیسے کے ٹکٹ لگتے ہیں؟

ابتدائی سائنس

مادّے کی قسمیں

مادّے کی تین قسمیں ہیں۔ ٹھوس۔ مایع۔ گیس۔

ٹھوس کا مطلب ہے ٹھوس۔ جیسے ٹھوس دلائل۔ ٹھوس اقدامات۔ ٹھوس نتائج وغیرہ۔

ٹھوس دلائل ایسے دعوّوں کے لئے لاتے جاتے ہیں جو خود کمزور ہو۔ سب سے ٹھوس دلیل اب تک لاٹھی ہی ثابت ہوئی ہے۔ بھینسوں کے لئے بھی۔ انسانوں کے لئے بھی۔

ٹھوس اقدامات اتنے ٹھوس ہوتے ہیں کہ کبھی نہیں کئے جاتے، بس حکومتیں ان کے ٹھوس وعدے کیا کرتی ہیں۔ ٹھوس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسی حکومتیں بہت دن نہیں رہتیں۔

ٹھوس اشیا اپنی شکل نہیں بدلتیں۔ ہاں دوسروں کی بدل دیتی ہیں۔ پتھر ٹھوس ہے۔ جیسا ہے ویسا ہی رہتا ہے لیکن کسی آدمی کے لگے تو وہ کیسا ہی ٹھوس ہو۔ اس میں سے مائع اور گیس وغیرہ نکلنے لگتے ہیں۔ مایع جیسے آنسو۔ گیس جیسے آہیں گالیاں وغیرہ۔

مایع

مایع کا مطلب آپ جانتے ہی ہیں لہٰذا تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، پانی



سب سے ٹھوس دلیل

بھی مایع ہے: دودھ بھی مایع ہے۔ اسی لئے مثل مشہور ہے۔ مایع کو مایع ملے کر کر لمبے ہاتھ — بعض اوقات مایع کو مایع میں ملانے کا نتیجہ بڑا ٹھوس نکلتا ہے چنانچہ بعض گوالوں نے اسی فارمولے پر عمل کر کے بڑے بڑے مکان کھڑے کر لئے ہیں

یہ قول بھی دودھ والوں ہی پر صادق آتا ہے۔ مایع تیرے تین نام: پرسا، پرسُو، پرس رام۔

بعض اوقات ٹھوس کو ٹھوس سے ٹکرا کر بھی مایع حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً بھینس کو ڈنڈے ٹکرایا جائے تو مایع دیتی ہے ورنہ نہیں دیتی۔

مایع کو سیال بھی کہتے ہیں جیسے آتشِ سیال۔ ہیر سیال

گیس

گیس کا مطلب بھی ہمارے عزیز طالب علموں سے مخفی نہ ہوگا جسے دیکھو اس کی شکایت لئے پھرتا ہے۔ یہاں ہم اس کے لئے ایک آزمودہ نسخہ درج کرتے ہیں :

اجوائن۔ کالا نمک۔ کلونجی اور اطریفل ہم وزن لیجئے اور ہتھیلی پر، اپنی ہتھیلی پر رکھ کر پھانک لیجئے۔ انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔ سوڈا واٹر بھی مفید ہے

گرمیاں آتی ہیں تو کراچی کا محکمہ واٹر سپلائی پانی کے نلکوں میں گیس سپلائی کرنے لگتا ہے۔ اسی لئے لوگ غسل خانوں میں روٹی پکاتے اور باورچی خانوں میں (پسینہ میں) نہاتے دیکھے جاتے ہیں۔

حرارت

حرارت کا مطلب ہے گرمی۔ گرمی کا لفظ آسان ہے۔ اسے استعمال کریں تو خطرہ ہے کہ طالب علموں کی سمجھ میں آجائے گا اور تعلیم کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اصطلاحیں مشکل ہی اچھی لگتی ہیں۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کو بدلنے میں بھی ہچکچاہٹ اور تاخیر اسی وجہ سے ہے۔

حرارت ناپنے کا آلہ تھرمامیٹر کہلاتا ہے۔ جوں جوں حرارت بڑھے گی اس کا پارا چڑھتا جائے گا۔ آدمی بھی اسی اصول پر کام کرتا ہے۔ پیسے والے غریبوں کے مطالبات سنتے ہیں۔ گرمی کھاتے ہیں اور ان کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ حرارت سے چیزیں پھیلتی ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ایک آپ بھی جانتے ہوں گے کہ جب تک کسی کی مٹھی گرم نہ کی جائے۔ کام نہیں کرتا۔



کشش کے اصول

کشش کئی طرح کی ہوتی ہے۔ پیسے کی کشش۔ کرسی کی کشش۔ جنسی کشش وغیرہ۔ دنیا کے سارے کاروبار اور قوم کی بے لوث خدمتیں پہلی دو کششوں کے باعث ہیں۔ تیسری کشش آج کل ناولوں اور فلموں میں پڑتی ہے۔ اسے ڈالنے کے بعد ان چیزوں میں اور کچھ۔ کہانی اور پلاٹ تک ڈالنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

کششِ ثقل

یہ نیوٹن نے دریافت کی تھی۔ غالباً اس سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ نیوٹن اس سے درختوں سے سیب گرایا کرتا تھا، آج کل سیڑھی پر چڑھ کر توڑ لیتے ہیں۔ آپ

نے دیکھا ہوگا کہ کوئی شخص حکومت کی کرسی پر بیٹھ جائے تو اس کے لئے اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ زبردستی اٹھاتے ہیں۔ یہ بھی کششِ ثقل کے باعث ہے۔

کششِ انابیب شعری

انابیب انب کی جمع ہے۔ یہ عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہمیں نہیں آتے۔ کشش کا مطلب کشش۔ شعری کا مطلب شعری۔

یہ شاید اس کشش کا نام ہے جس کے بل پر لوگ مشاعروں میں کھنچے آتے ہیں۔ لیکن ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔

ہمارے دوست عبدالعزیز خالد کے کسی مجموعے کا نام بھی ہو سکتا ہے۔

پانی

پانی کئی طرح کا ہوتا ہے۔ بارش کا پانی۔ نل کا پانی۔ کوکا کولا۔ گرائپ واٹر۔ سیون اپ۔ چلّو بھر پانی وغیرہ۔ متحدہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان پانی بھی ہوتا تھا۔ اب شاید نہیں ہوتا۔

پانی بڑے کام کی چیز ہے۔ لیکن اس میں ایک خرابی ہے۔ یہ اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔ جب ہم اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ تب بھی ہمیں اس پر یہی اعتراض تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ انسانوں کو بھی اپنی سطح ہموار رکھنی چاہیئے۔ یہ غلط بات ہے۔ پانی پانی ہے۔ انسان انسان ہے۔ ہمارے سائنسدان آج کل بڑے بڑے دستخطوں سے لمبے لمبے بیان نکال رہے ہیں تاکہ یہ رجحان نہ پھیلے۔ انھیں چاہیئے کہ پانی کو سمجھائیں کہ میاں تو بھی اپنی سطح اونچی نیچی رکھا کر۔ اونچ نیچ میں بڑے

فائدے ہیں۔ سطح ہموار رکھنے سے کیا حاصل۔ کچھ عاقبت کی بھی فکر ہے تجھے؟

کراچی میں کبھی کبھی اتنی بارش ہو جاتی ہے کہ سارا شہر پانی پانی ہو جاتا ہے سوائے کارپوریشن اور انتظامیہ کے۔ کبھی کبھی بارش کی بجائے قلندر کی بات، سے بھی ایسا ہو جاتا ہے۔

روشنی

روشنی بڑی اچھی چیز ہے۔ سوائے روشنی طبع کے جو بلا بھی ہو جاتی ہے۔ روشنی پیدا کرنے کے کئی ذرائع ہیں۔ موم بتی۔ بلب۔ لالٹین۔ سورج وغیرہ۔ سورج روشنی تو خوب دیتا ہے لیکن دن میں اُس کا نکلنا بے فائدہ ہے۔ دن میں تو ویسے بھی روشنی ہوتی ہے۔ رات کو نکلا کرتا تو اچھا تھا۔

روشنی کا ایک مصرف یہ ہے کہ اس پر پروانے آتے ہیں اور پروانہ وار نثار ہوتے ہیں۔ شمعیں نہ ہوتیں تو پروانوں کے لئے فیملی پلاننگ کا محکمہ کھولنا پڑتا۔

روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ اندھیرے کی رفتار کبھی ناپی نہیں گئی۔ اس سے کچھ زیادہ سمجھئے۔ اندھیرے کو ظلمات بھی کہتے ہیں۔ بحر ظلمات ایک سمندر ہے جس سے علامہ اقبال کے بیان کے مطابق پرانے زمانے کے مسلمان ریس کورس کا کام لیا کرتے تھے یعنی ان میں گھوڑے دوڑاتے تھے۔

سوالات

۱۔ ہمارے محلے کی سڑکوں پر ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے۔ اس کی وجہ پر روشنی ڈالو۔

۲۔ پانی کے جوش میں آنے کا درجہ ۱۰۰ سنٹی گریڈ ہے۔ انسان کے جوش میں آنے کا کیا درجہ ہے، حضرت جوش ملیح آبادی کا درجہ حرارت بھی بتاؤ!

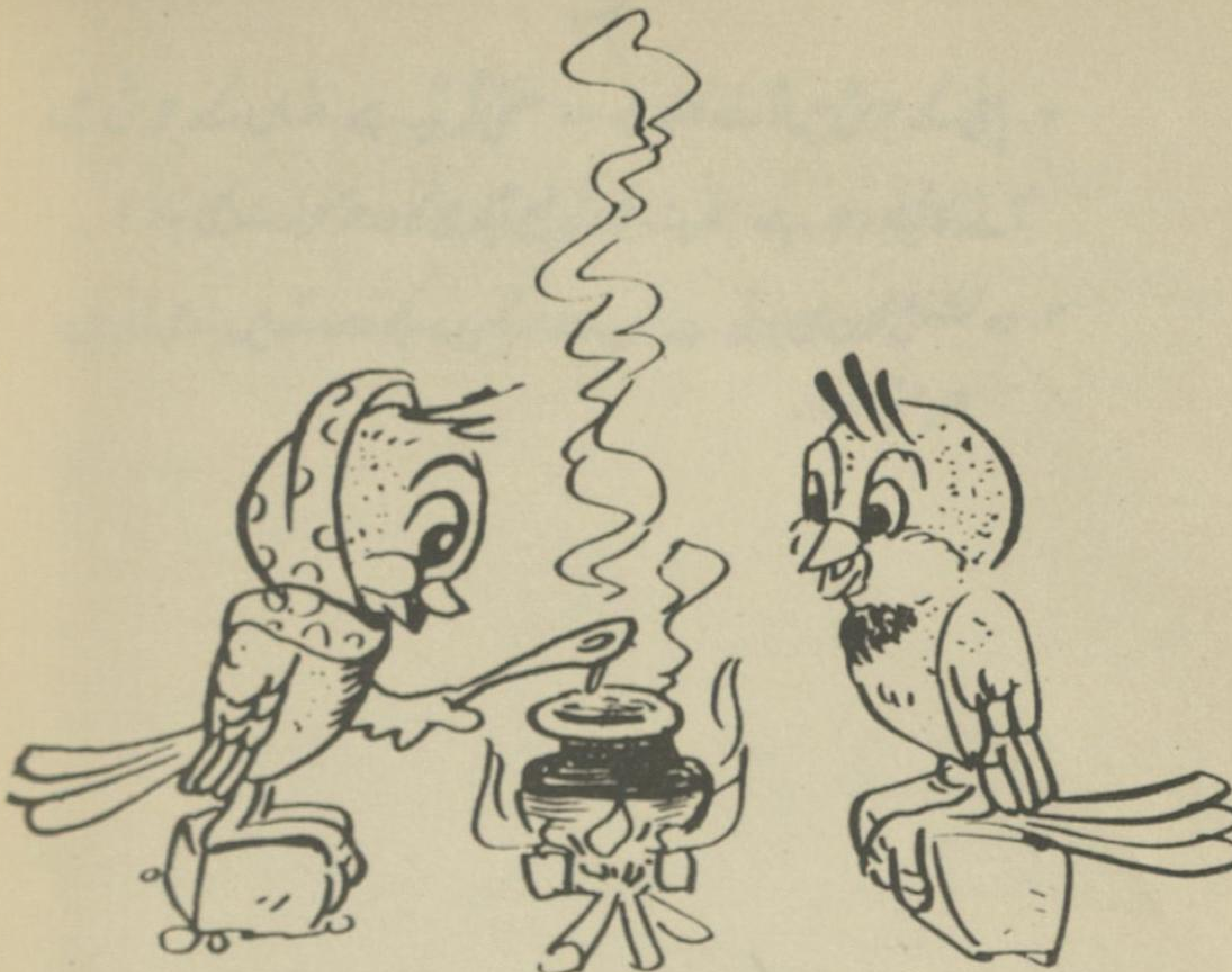
۳۔ وہ کشش کون سی ہوتی ہے جس سے سرکاریں کچے دھاگے میں بندھی آتی ہیں۔

۱۹ر مئی ۱۹۷۰ء



دُوسری دفعہ کا ذکر ہے

(چند سبق آموز کہانیاں)



چڑا اور چڑیا

ایک تھی چڑیا، ایک تھا چڑا۔ چڑیا لائی دال کا دانا، چڑا لایا چاول کا دانا۔ اس سے کھچڑی پکائی۔ دونوں نے پیٹ بھر کر کھائی۔ آپس میں اتفاق ہو تو ایک ایک دانے کی کھچڑی بھی بہت ہو جاتی ہے۔

چڑا بیٹھا اُونگھ رہا تھا کہ اس کے دل میں وسوسہ آیا کہ چاول کا دانا بڑا ہوتا ہے، دال کا دانا چھوٹا ہوتا ہے۔ پس دوسرے روز کھچڑی پکی تو چڑے نے کہا اس میں چھپن حصّے مجھے دے، چوالیس حصّے تُو لے۔ اے بھاگوان۔ پسند کر یا ناپسند کر۔ حقائق سے آنکھ مت بند کر۔ چڑے نے اپنی چونچ میں سے چند نکات بھی نکالے اور اُس بی بی نے آگے ڈالے۔ بی بی حیران ہوئی بلکہ رو رو کر ہلکان ہوئی کہ اس کے ساتھ تو میرا جنم کا ساتھ تھا لیکن کیا کر سکتی تھی۔

دوسرے دن پھر چڑیا دال کا دانا لائی اور چڑا چاول کا دانا لایا۔ دونوں نے الگ الگ ہنڈیا چڑھائی، کھچڑی پکائی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دو ہی دانے ہیں۔ چڑے نے چاول کا دانا کھایا، چڑیا نے دال کا دانا اٹھایا۔ چڑے کو خالی چاول سے پیچش ہوگئی چڑیا کو خالی دال سے قبض ہوگئی۔ دونوں ایک حکیم کے پاس گئے جو ایک بلا تھا۔ اس نے دونوں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور پھیرتا ہی چلا گیا۔ ع

دیکھا تو تھے دو مُشت پر

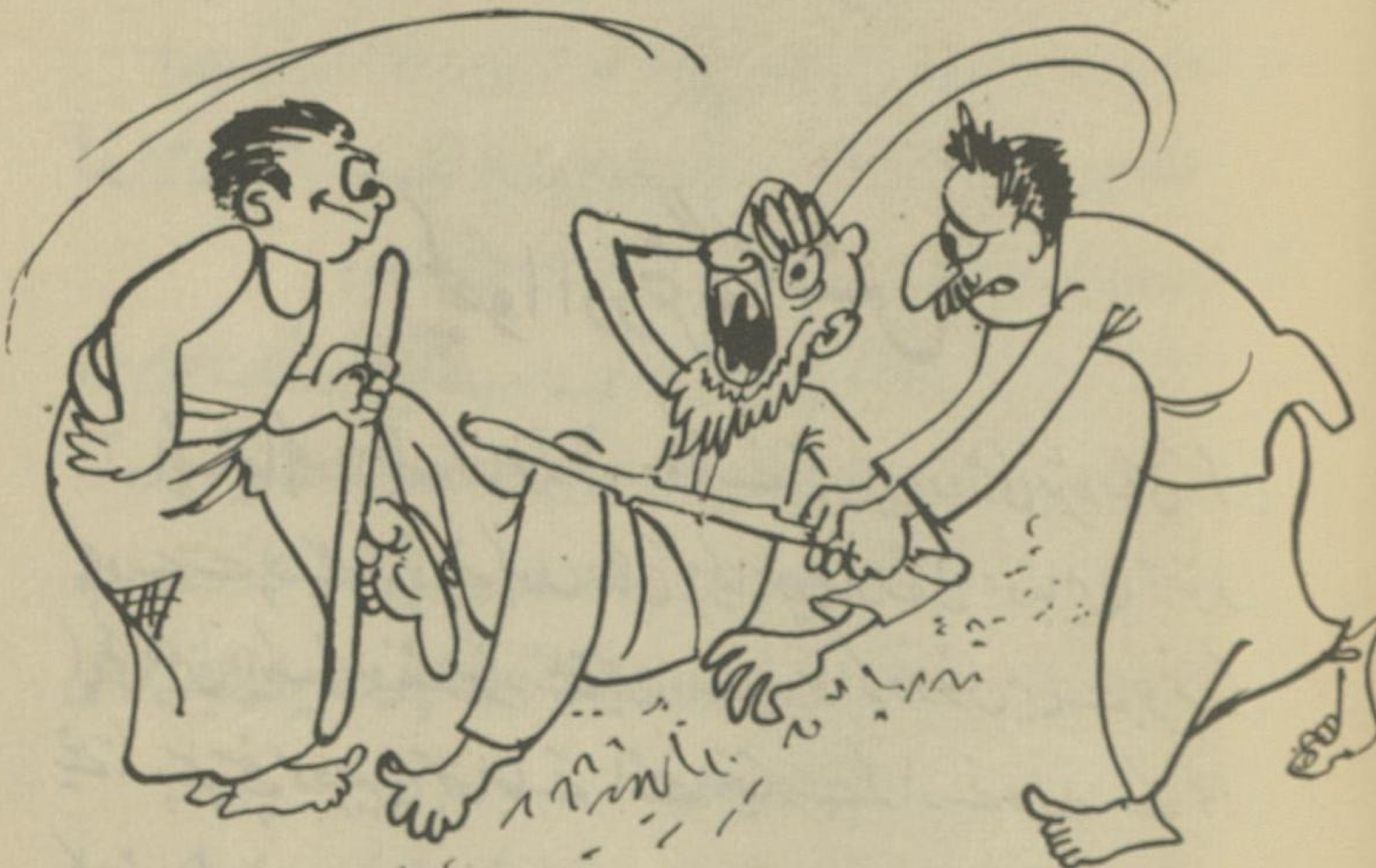
یہ کہانی بہت پرانے زمانے کی ہے۔ آج کل تو چاول ایکسپورٹ ہو جاتا ہے، اور دال مہنگی ہے۔ اتنی کہ وہ لڑکیاں جو مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے زمانے میں دال بگھارا کرتی تھیں، آج کل فقط شیخی بگھارتی ہیں۔

۶ر جولائی ۱۹۷۰ء

ایک گورو کے دو چیلے

ایک تھا گورو، بڑا نیک دھرماتما۔ دو اس کے چیلے تھے۔ وفادار۔ جاں نثار، گورو کے خون کی جگہ اپنا پسینہ بہانے کے لئے تیار۔ ایک کا شُبھ نام پوربومل تھا۔ دوسرے کا پچھمی چند۔ گوروجی جب لوگوں کو اُپدیش دینے اور ان کی مرادیں پوری کرنے کے بعد آرام کرنے کو لیٹتے، تو چیلا پوربومل ان کی دہنی ٹانگ دباتا۔ اور پچھمی چند بائیں ٹانگ کی ٹہل سیوا کرتا۔ دونوں اپنے اپنے حصے کی ٹانگ کی مٹھی چاپی کرتے۔ تیل چپڑ کر اُسے چمکاتے، جھنڈیاں اور گھنگرو باندھ کر اُسے سجاتے۔ اس پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ ایک روز کرنا پرماتما کا ایسا ہوا کہ گوروجی ایک کروٹ لیٹ گئے اور ان کی بائیں ٹانگ دہنی ٹانگ کے اوپر جا پڑی۔ چیلے پوربومل کو بہت غصہ آیا، اس نے فوراً ایک ڈنڈا اٹھایا اور بائیں ٹانگ کے رسید کیا۔ گوروجی نے بلبلا کر داہنی ٹانگ اوپر کر لی۔ اب پچھمی چند کی غیرت نے جوش مارا۔ اس نے اپنی لٹھیا اٹھائی اور داہنی ٹانگ کی خوب سی مرمت کی۔ گوروجی بہت چلاتے کہ ظالمو! کیوں مارے ڈالتے ہو۔ ہائے! لیکن چیلے کب مانتے تھے۔ گوروجی کی ٹانگیں سوج کر کُپّا ہو گئیں۔ مدتوں ہلدی چونا لگانا پڑا۔

اب آگے چلیے۔ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ لالہ پچھمی چند کے کئی بیٹے تھے۔ بڑے ہونہار اور ہوشیار۔ پشاوری مل، سندھو رام، لاہوری مل اور بلوچ رائے۔ لالہ جی کا



دیہانت ہوا تو یہ ٹانگ انھوں نے ورثے میں پائی۔ وہ گوروجی کی ٹانگ تو دباتے تھے لیکن کوئی ران کا حصہ زیادہ دباتا تھا۔ کوئی پنڈلی پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ آخر ایک زبردست جھگڑا ہوا اور طے ہوا کہ ہم اپنا حصہ الگ کر لیں گے۔ لالہ پور بول نے کہا ہاں! ہاں! ٹھیک کر رہے ہو۔ میں بھی اپنے حصے کی ٹانگ کاٹ کر لے جا رہا ہوں۔

اب ان برخورداروں نے گنڈاسہ منگایا۔ ایک نے ران سنبھالی بوری میں ڈالی۔ دوسرے نے پنڈلی لے لی۔ تیسرے نے گھٹنا اٹھایا۔ چوتھے نے باقی کو سمیٹا اور گھر کی راہ لی اور اس کے بعد سبھی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

گوروجی کا کیا ہوا؟ مرے یا جیے، جیے تو کتنے دن تک جیے، اس کا کہانی میں ذکر نہیں۔

۶ جولائی ۱۹۷۰ء

کچھوا اور خرگوش

ایک تھا کچھوا، ایک تھا خرگوش۔ دونوں نے آپس میں دوڑ کی شرط لگائی۔ کوئی کچھوے سے پوچھے کہ تو نے کیوں لگائی؟ کیا سوچ کر لگائی؟ دنیا میں احمقوں کی کمی نہیں، ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ طے یہ ہوا کہ دونوں میں سے جو نیم کے ٹیلے تک پہلے پہنچے، وہ میری سمجھا جائے۔ اُسے اختیار ہے کہ ہارنے والے کے کان کاٹ لے۔

دوڑ شروع ہوئی۔ خرگوش تو یہ جا وہ جا۔ پلک جھپکنے میں خاصی دُور نکل گیا۔ میاں کچھوے وضعداری کی چال چلتے منزل کی طرف رواں ہوئے، تھوڑی دُور پہنچے تو سوچا بہت چل لئے اب آرام بھی کرنا چاہیئے۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے شاندار ماضی کی یادوں میں کھو گئے جب اس دنیا میں کچھوے راج کیا کرتے تھے۔۔۔ سائنس اور فنونِ لطیفہ میں بھی ان کا بڑا نام تھا۔ یونہی سوچتے میں آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ خود تو تختِ شاہی پہ بیٹھے ہیں۔ باقی زمینی مخلوق شیر، چیتے، خرگوش آدمی وغیرہ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں یا فرشی سلام کر رہے ہیں۔ آنکھ کھلی تو ابھی سستی باقی تھی۔ بولے ابھی کیا جلدی ہے؟ اس خرگوش کے بچے کی کیا اوقات ہے۔ میں بھی کتنے عظیم ورثے کا مالک ہوں، واہ بھئی وا میرے کیا کہنے ——

جانے کتنا زمانہ سوتے رہے تھے۔ جب جی بھر کے سُستا لئے تو پھر ٹیلے کی

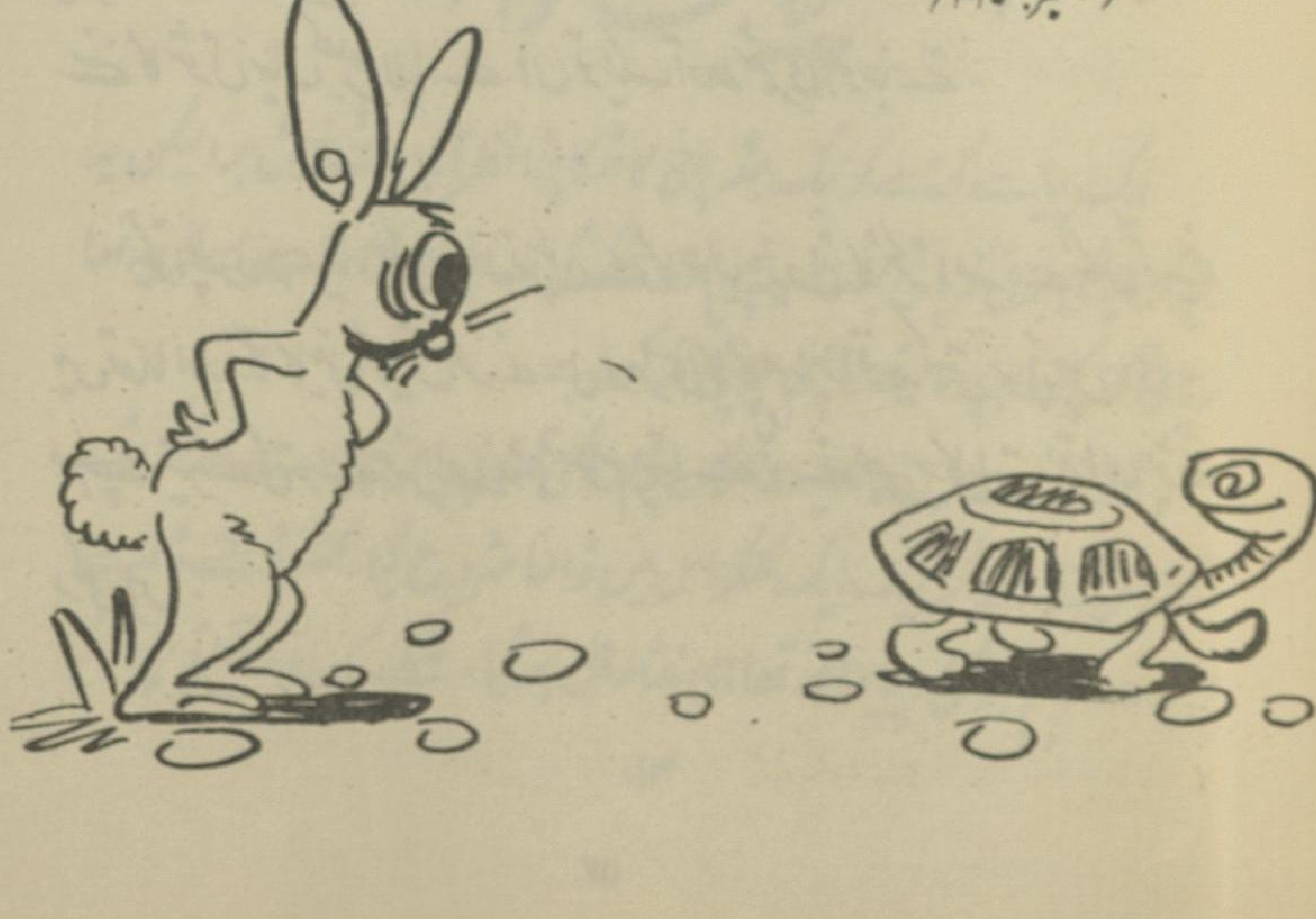
طرف رواں ہوئے۔ وہاں پہنچے تو خرگوش کو نہ پایا۔ بہت خوش ہوئے۔ اپنے کو داد دی کہ واہ رے مستعدی۔ میں پہلے پہنچ گیا۔ بھلا کوئی میرا مقابلہ کر سکتا ہے؟

اتنے میں ان کی نظر خرگوش کے ایک پلّے پر پڑی جو ٹیلے کے دامن میں کھیل رہا تھا۔ کچھوے نے کہا۔ اے برخوردار تو خرگوش خاں کو جانتا ہے؟

خرگوش کے بچے نے کہا۔ جی ہاں۔ جانتا ہوں میرے ابا حضور تھے۔ معلوم ہوتا ہے، آپ ہیں وہ کچھوے میاں جنھوں نے باوا جان سے شرط لگائی تھی۔ وہ تو پانچ منٹ میں یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد مدتوں آپ کا انتظار کرتے رہے۔ آخر انتقال کر گئے۔ جاتے ہوئے وصیت کر گئے تھے کہ کچھوے میاں آئیں تو اُن کے کان کاٹ لینا۔ اب لائیے ادھر کان۔

کچھوے نے فوراً اپنے کان اور اپنی سری خول کے اندر کر لی۔ آج تک چھپائے پھرتا ہے۔

۶ر دسمبر ۱۹۷۰ء



لومڑی اور کوّا

ایک کوّا روٹی کا ٹکڑا لیئے ہوئے ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھا تھا۔ ایک لومڑی کا گزر ادھر سے ہوا۔ منہ میں پانی بھر آیا (لومڑی کے)۔ سوچا کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ یہ اپنی چونچ کھول دے اور یہ روٹی کا ٹکڑا میں جھپٹ لوں۔

پس اس نے مسکین صورت بنا کر اور منہ اوپر اٹھا کہا "کوّے میاں! اسلام۔ ترے حسن کی کیا تعریف کروں کچھ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔ واہ واہ وا، چونچ بھی کالی، پر بھی کالے۔ آج کل تو دنیا کا مستقبل کالوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ افریقہ میں بھی بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے۔ لیکن خیر یہ سیاست کی باتیں ہیں۔ آمدم برسر مطلب۔ میں نے تیرے گانے کی تعریف سنی ہے۔ تُو اتنا خوبصورت ہے تو گاتا بھی اچھا ہو گا۔ مجھے گانا سننے کا شوق یہاں کھینچ لایا ہے۔ ہاں تو ایک آدھ ٹھمری ہو جائے۔

کوّا پھولا نہ سمایا، لیکن سیانے پن سے کام لیا۔ روٹی کا ٹکڑا منہ سے نکال کر پنجے میں تھاما اور لگا کائیں کائیں کرنے۔ بی لومڑی کا کام نہ بنا تو یہ کہتی ہوئی چل دی۔ "ہت تیرے کی۔ بے سُرا بھانڈ۔ معلوم ہوتا ہے تُو نے بھی حکایات لقمان پڑھ رکھی ہیں"۔

۶ر دسمبر ۱۹۷۰ء



پیاسا کوّا

ایک پیاسے کوّے کو ایک جگہ پانی کا مٹکا پڑا نظر آیا، بہت خوش ہوا لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ پانی بہت نیچے فقط مٹکے کی تہہ میں تھوڑا سا ہے۔ سوال یہ تھا کہ پانی کو کیسے اوپر لائے۔ اپنی چونچ تر کرے۔

اتفاق سے اس نے حکایات لقمان پڑھ رکھی تھیں، پاس ہی بہت سے کنکر پڑے تھے، اس نے اٹھا کر ایک ایک کنکر اس میں ڈالنا شروع کیا۔ کنکر ڈالتے ڈالتے صبح سے شام ہو گئی۔ پیاسا تو تھا ہی نڈھال ہو گیا۔ مٹکے کے اندر نظر ڈالی تو کیا

دیکھتا ہے کہ کنکر ہی کنکر ہیں۔ سارا پانی کنکروں نے پی لیا ہے۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا ہت ترے لقمان کی، پھر بے سُدھ ہو کر زمین پر گر گیا اور مر گیا۔

اگر وہ کوا کہیں سے ایک نلکی لے آتا تو مٹکے کے منہ پر بیٹھا بیٹھا پانی کو چوس لیتا۔ اپنے دل کی مراد پاتا۔ ہر گز جان سے نہ جاتا۔

اتفاق میں برکت ہے

ایک بڑے میاں جنھوں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کمایا بنایا تھا آخر بیمار ہوئے، مرض الموت میں گرفتار ہوتے۔ ان کو اور تو کچھ نہیں، کوئی فکر تھی تو یہ کہ ان کے پانچوں بیٹوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ گاڑھی کیا پتلی بھی نہیں چھنتی تھی۔ بڑتے رہتے تھے۔ کبھی کسی بات پر اتفاق نہ ہوتا تھا حالانکہ اتفاق میں بڑی برکت ہے۔ آخر انھوں نے بیٹوں پر اتحاد اور اتفاق کی خوبیاں واضح کرنے کے لیے ایک ترکیب سوچی۔ اُن کو اپنے پاس بُلایا اور کہا۔ دیکھو اب میں کوئی دَم کا مہمان ہوں۔ سب جا کر ایک ایک لکڑی لاؤ۔

ایک نے کہا۔ لکڑی؟ آپ لکڑیوں کا کیا کریں گے؟ دوسرے نے آہستہ سے کہا۔ بڑے میاں کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ لکڑی نہیں۔ شاید لگڑی کہہ رہے ہیں۔ لگڑی کھانے کو جی چاہتا ہو گا۔ تیسرے نے کہا۔ نہیں۔ کچھ سردی ہے شاید آگ جلانے کو لکڑیاں منگاتے ہوں گے۔ چوتھے نے کہا: بابو جی۔ کوئلے لائیں؟

پانچویں نے کہا: نہیں اُپلے لاتا ہوں۔ وہ زیادہ اچھے رہیں گے۔

باپ نے کراہتے ہوئے کہا: "ارے نالائقو۔ میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔ کہیں سے لکڑیاں لاؤ جنگل سے۔"

ایک بیٹے نے کہا۔ یہ بھی اچھی رہی۔ جنگل یہاں کہاں؟ اور محکمہ جنگلات والے

لکڑی کہاں کاٹنے دیتے ہیں۔

دوسرے نے کہا۔ اپنے آپے میں نہیں ہیں، باپو جی۔ بک رہے ہیں جنوں میں کیا کیا کچھ۔

تیسرے نے کہا۔ بھئی لکڑیوں والی بات اپن کی تو سمجھ میں نہیں آئی۔

چوتھے نے کہا۔ بڑے میاں نے عمر بھر میں ایک ہی تو خواہش کی ہے اُسے پورا کرنے میں کیا ہرج ہے؟

پانچویں نے کہا۔ اچھا میں جاتا ہوں۔ ٹال پر سے لکڑیاں لاتا ہوں۔

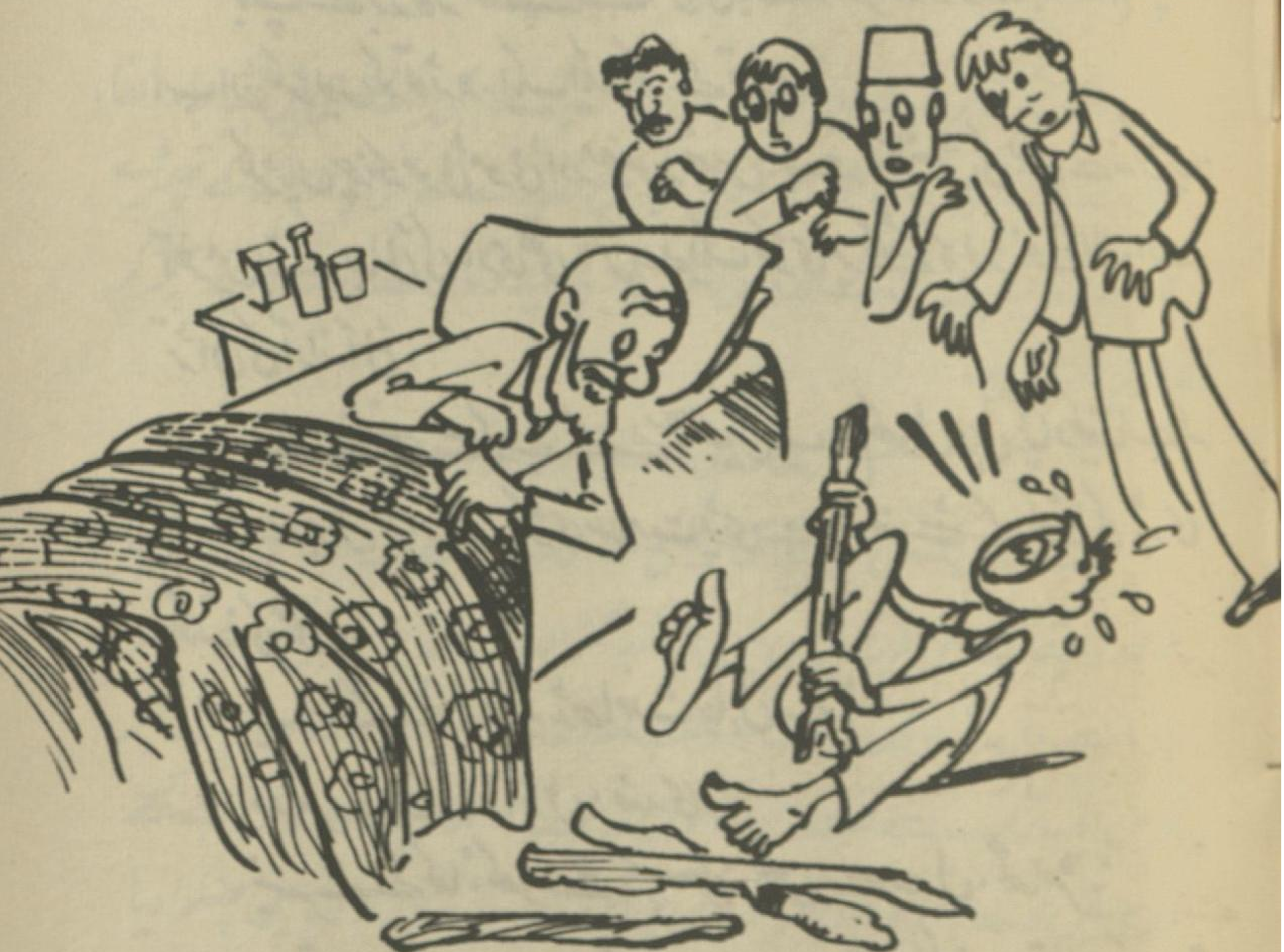
چنانچہ وہ ٹال پر گیا۔ ٹال والے سے کہا۔ خان صاحب ذرا پانچ لکڑیاں تو دینا۔ اچھی مضبوط ہوں۔

ٹال والے نے لکڑیاں دیں۔ ہر ایک خاصی موٹی اور مضبوط۔ باپ نے دیکھا۔ تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ یہ بتانا بھی خلاف مصلحت تھا کہ لکڑیاں کیوں منگائی ہیں اور سے کیا اخلاقی نتیجہ نکالنا مقصود ہے۔ آخر بیٹوں سے کہا۔ اب ان لکڑیوں کا گٹھا باندھ دو۔

اب بیٹوں میں پھر چہ میگوئیاں ہوئیں، گٹھا؟ وہ کیوں؟ اب رسی کہاں سے لائیں۔ بھئی بہت تنگ کیا اس بڈھے نے۔ آخر ایک نے اپنے پاجامے میں سے ازار بند نکالا اور گٹھا باندھا۔

بڑے میاں نے کہا۔ "اب اس گٹھے کو توڑو۔"

بیٹوں نے کہا۔ "لو بھئی یہ بھی اچھی رہی۔ کیسے توڑیں۔ کلہاڑا کہاں سے لائیں۔"



باپ نے کہا۔ کلہاڑے سے نہیں۔ ہاتھوں سے توڑو۔ گھٹنے سے توڑو۔"
حکمِ والد مرگِ مفاجات۔ پہلے ایک نے کوشش کی۔ پھر دوسرے نے۔ پھر تیسرے نے۔ پھر چوتھے نے۔ پھر پانچویں نے۔ لکڑیوں کا بال بیکا نہ ہوا۔ سب نے کہا۔ "باؤجی ہم سے نہیں ٹوٹتا یہ لکڑیوں کا گٹھا۔"

باپ نے کہا: "اچھا۔ اب ان لکڑیوں کو الگ الگ کر دو۔ ان کی رسّی کھول دو۔"

ایک نے جل کر کہا: "رسّی کہاں ہے؟ میرا ازار بند ہے۔ اگر آپ کو کھلوانا تھا تو گٹھا بندھوایا ہی کیوں تھا۔ لاؤ بھئی کوئی پنسل وینا میں ازار بند ڈال لوں پاجامے میں۔"

باپ نے بزرگانہ شفقت سے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "اچھا اب ان لکڑیوں کو توڑ دو۔ ایک ایک کر کے توڑ دو۔"

لکڑیاں چونکہ موٹی موٹی اور مضبوط تھیں۔ بہت کوشش کی کسی سے نہ ٹوٹیں۔ آخر میں بڑے بھائی کی باری تھی۔ اس نے ایک لکڑی پر گھٹنے کا پورا زور ڈالا۔ اور تڑاق کی آواز آئی۔

باپ نے نصیحت کرنے کے لئے آنکھیں یک دم کھول دیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ بڑا بیٹا بے ہوش پڑا ہے۔ لکڑی سلامت پڑی ہے۔ آواز بیٹے کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹنے کی تھی۔

ایک لڑکے نے کہا: "یہ بڈھا بہت جاہل ہے۔"

دوسرے نے کہا: "اڑیل، ضدی۔"

تیسرے نے کہا: "کھوسٹ، سنکی۔ عقل سے پیدل، گھامڑ۔"

چوتھے نے کہا: "سارے بڈھے ایسے ہی ہوتے ہیں کمبخت مرتا بھی نہیں۔"

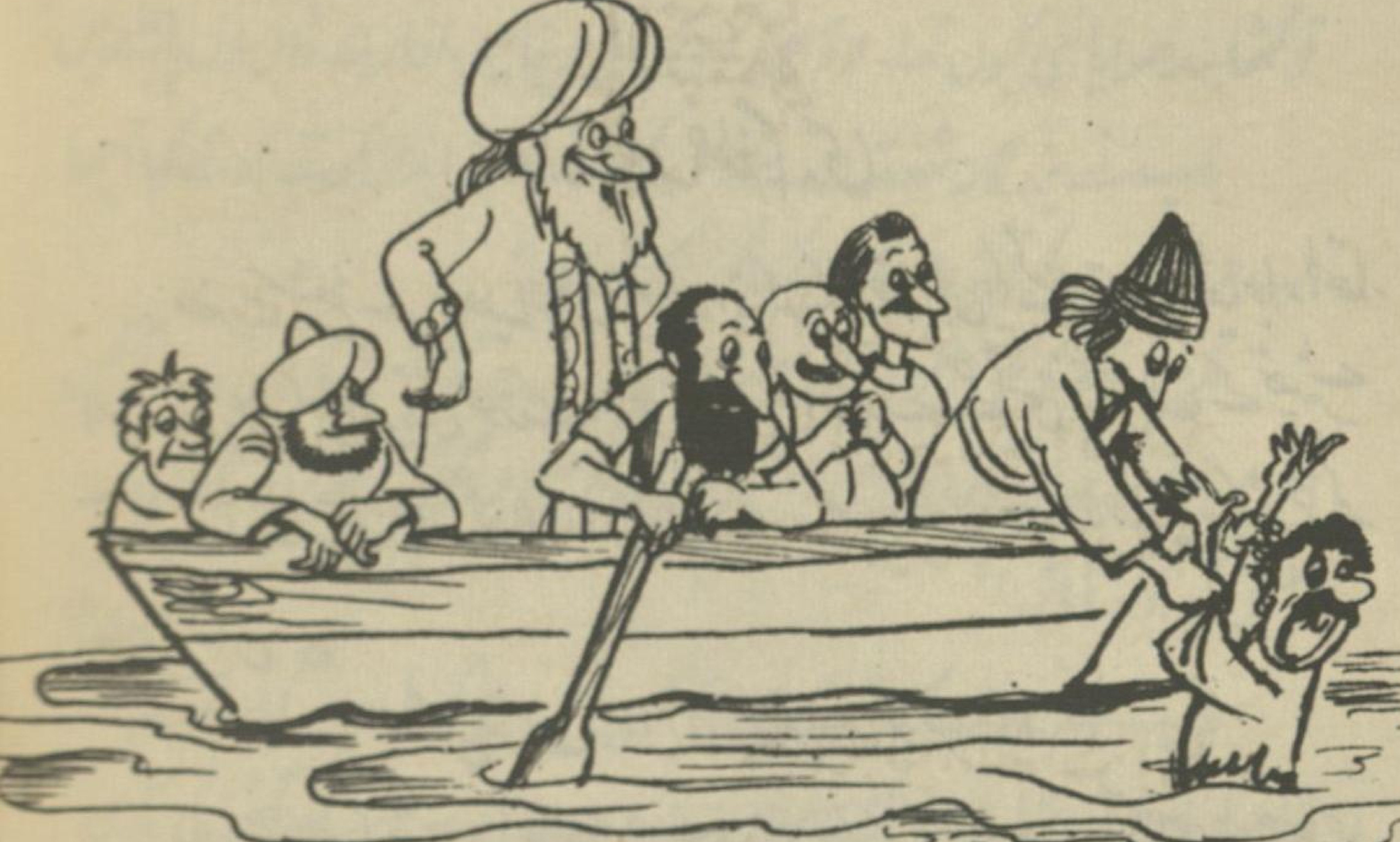
بڈھے نے اطمینان کا سانس لیا کہ بیٹوں میں کم از کم ایک بات پر تو اتفاقِ رائے ہوا۔ اس کے بعد آنکھیں بند کیں اور نہایت سکون سے جان دے دی۔

دانا اور غلامِ عجمی

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرمودہ اند کہ ایک غلام عجمی ایک کشتی میں بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے پہلے کبھی دریا کی صورت نہ دیکھی تھی۔ بیچ دھارے کے کشتی پر موجوں کے تھپیڑے جو پڑے تو لگا چیخنے چلانے اور واویلا مچانے۔ ہر چند لوگوں نے دلاسا دیا۔ پچکار پچکار کر سمجھایا لیکن ع

کسی صورت نہ دل کی بے قراری کو قرار آیا

ایک دانا بھی کشتی میں بیٹھا تھا۔ شیخ سعدیؒ کے زمانے میں دانا اسی طرح جا بجا موجود رہتے تھے جس طرح ہر بس میں ایک کنڈکٹر اور ہر محکمے میں افسر تعلقات عامہ ہوتا ہے۔ اس نے لوگوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تم لوگ کہو تو میں ایک ترکیب سے اسے ابھی خاموش کرا دوں؟ مسافر بے لطف ہو رہے تھے فارسی میں بولے "ازیں چہ بہتر"۔ اس پر اُس نے مسافر مذکور کو دریا میں پھنکوا دیا اور جب وہ چند غوطے کھا کر اُدھ مُوا ہو گیا تو ملاحوں سے کہا۔ اب اسے کشتی میں گھسیٹ لاؤ۔ احتیاط کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ ملاحوں سے پوچھ لیتا کہ بھائیو تمہیں تیرنا بھی آتا ہے؟ فرض کیجئے وہ تیراکی میں اس دانا کی طرح اور ہماری طرح کورے ہوتے غضب ہو جاتا۔ دانا صاحب کی بھد ہو جاتی۔ مقدمہ الگ ان پر چلتا۔ لیکن خیر، ایک ملاح اُسے کشتی کے قریب گھسیٹ لایا۔ اور وہ شخص دونوں ہاتھوں سے کشتی کے



کنارے کو پکڑ کر اس پر سوار ہو گیا اور آرام سے چپ چاپ ایک کونے میں جا بیٹھا۔ لوگوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ اس میں کیا بھید ہے؟ اس زمانے میں لوگ عموماً کند ذہن ہوتے تھے، ذرا ذرا سی بات پوچھنے کے لئے داناؤں کے پاس دوڑے جاتے تھے۔ دانا نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ اے سادہ لوحو۔ یہ شخص اس سے پہلے نہ غرق ہونے کی مصیبت کو جانتا تھا نہ کشتی کو سلامتی کا ذریعہ مانتا تھا۔ اب دونوں باتوں سے واقف ہو گیا ہے تو آرام سے بیٹھ گیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا... لیکن نتیجہ نکالنے کا ہمارے پاس وقت نہیں، اب دوسری حکایت سنیئے:

نوشیرواں اور نمک

نوشیرواں عادل کے ملازم ایک روز شکار گاہ میں اپنے آقا کے لئے کباب بھوننے لگے تو نمک موجود نہ تھا۔ اب اس سے اندازہ کیجئے کہ جس بادشاہ کے نوکر نمک تک ساتھ نہ لے کر چلیں اس کی بادشاہی کیسے چلتی ہوگی۔ خیر کسی نوکر کو گاؤں بھیجا گیا کہ نمک لائے۔ نوشیرواں نے دیکھا تو فوراً جاتے ہوئے نوکر کو آواز دے کر فرمایا۔ خبردار! نمک قیمت دے کر لانا۔ ورنہ بدرسمی سے گاؤں برباد ہو جائے گا۔ حاضرین میں سے کسی نے عرض کی "جہاں پناہ، ذرا سے نمک سے کیا بدرسمی ہو سکتی ہے؟ نوشیرواں بہادر نے فرمایا۔ یاد رکھو۔ دنیا میں ظلم کی بنیاد پہلے تھوڑی تھی لیکن جو شخص آتا گیا اس پر بڑھاتا گیا۔ اپنی بات کی تائید میں نوشیرواں نے شیخ سعدی کا ایک فارسی قطعہ بھی پڑھا۔ چونکہ آج کل فارسی ہمارے اسکولوں میں نہیں پڑھائی جاتی لہٰذا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:۔

اگر رعیت کے باغ سے بادشاہ ایک سیب مفت لیتا ہے تو اس کے غلام درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ اگر بادشاہ پانچ انڈے بھی مفت کسی کے کھائے تو لشکر والے ہزاروں مرغ مفت میں لے کر بھون کھائیں۔ اگر بادشاہ ایک لائسنس بھی اپنے کسی عزیز کو دیتا ہے تو مصاحبین سارا ملک اس کے نام پر بیچ کھاتے ہیں۔

نتیجہ: (۱) شکار کو جاتے ہوئے دیکھ لینا چاہیے کہ نمک مرچ وغیرہ ہیں کہ نہیں

۲۔ لائسنس پرمٹ اپنے عزیزوں کے علاوہ دوسروں کو بھی دینے چاہئیں۔

وزیر اور درویش

یکے از وزرائے معزول شدہ بحلقہ درویشاں در آمد ......

ہم تو فارسی بولنے لگے۔ خیر اردو پر آتے ہیں اگرچہ اس میں بھی خطرہ ہے کیونکہ لاہور میں اردو نمبر پلیٹ والی گاڑیوں کا چالان ہونے لگا ہے۔ ہاں تو قصہ یہ ہے کہ وزارت سے نکالا ہوا ایک وزیر درویشوں کے گروہ میں جا شامل ہوا اور اس صحبت میں اس کے دل کو اس قدر آرام ملا کہ حکومت کے دنوں میں ہرگز نصیب نہ ہوا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے اسے پھر وزارت کے لئے طلب فرمایا تو بجائے اس کے کہ اپنی گدڑی دُدڑی پھینک زلفیں دُلفیں منڈوا، چوغہ و دغہ اَونے پونے بیچ اپنی کار پر جھنڈا لگوانے کو دوڑا دوڑا آتا، اس نے بواپسی ڈاک کہلا بھیجا کہ حضور معافی چاہتا ہوں۔ معزولی بہ از مشغولی۔ اس نوکری سے میں یوں ہی بھلا۔

آنانکہ بکنجِ عافیت بنشستند
دندانِ سگ و دہانِ مردم بستند
کاغذ بدریدند و قلم بشکستند
وز دست و زبانِ حرف گیراں رستند

بادشاہ نے پھر ارجنٹ تار دیا

"اے سابق وزیر (اسٹاپ) سلطنت کے کاموں کے لئے تجھ ایسا لائق

اور تجربہ کار آدمی مناسب ہے (اسٹاپ) فوراً آ (اسٹاپ) تنخواہ بڑھا دیں گے (اسٹاپ) کوٹھی کار اس کے علاوہ"

لیکن وہ اپنی ہٹ کا پکا نہ مانا۔ کہلا بھیجا۔ جہاں پناہ۔ کوئی اور انتظام کر لیجئے۔ اصل بات تو یوں ہے کہ جو شخص واقعی عقل مند ہوگا وہ ان بکھیڑوں میں مبتلا ہونا کبھی پسند نہ کرے گا۔ فرد

ہمائے بر سر مرغاں ازاں شرف دارد

کہ استخواں خورد و طائرے نیازارد

یہ حکایت ادھوری معلوم ہوتی ہے بادشاہ کے سیکرٹری نے یہ پیغام مع فارسی فرد کے بادشاہ کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا ہوگا۔ حضور! اس کا تو دماغ خراب ہے میں حاضر ہوں مجھے وزیر بنا لیجئے۔

۷ر اپریل ۱۹۶۹ء

یہ حکایتیں الیکشن ۱۹۷۰ء کے دنوں کی یادگار ہیں

گوشت اور ہڈی

ایک کتا اور ایک گدھا اکٹھے چلے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک لفافہ پڑا ملا۔ گدھے نے اُسے اٹھایا اور کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا، حامل رقعۂ ہذا کو حسب ذیل چیزیں مفت دی جائیں گی۔

بھوسہ۔ سبز چارہ۔ چنے ......

کُتّے نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ برادرم ذرا دیکھنا اس فہرست میں نیچے جا کر گوشت اور ہڈی کا ذکر بھی ہو گا۔ گدھا سارا پروانہ پڑھ گیا۔ اس میں کوئی ایسی چیز مذکور نہ تھی۔

کتے نے کہا۔ تب یہ بیکار چیز ہے۔ پھینک دو اسے۔

پارٹی منشوروں میں فقط گدھوں ہی کی بات نہیں ہونی چاہیئے۔ کتوں کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔

ہم کیوں بھاگیں

ایک خرکار جنگل میں گدھوں پر مال لادے چلا جا رہا تھا کہ ڈاکوؤں کا کھٹکا ہوا وہ گدھوں کو پکارا: "خطرہ! خطرہ!! بھاگو، بھاگو! ڈاکو آ رہے ہیں!" گدھوں نے کہا۔ تم بھاگو، ہم کیوں بھاگیں۔ ہمیں تو بوجھا ڈھونا ہے۔ تیرا بوجھا ہو یا کسی اور کا ہو۔

اگر مال کے منافع میں کچھ حصّہ گدھوں کا بھی ہوتا۔ تو وہ ہرگز ایسی بات نہ کہتے۔

متحدہ محاذ

ایک شیر اور گدھا شکار کرنے گئے انھوں نے کئی جانور مارے آخر شکار تقسیم کرنے بیٹھے۔ شیر نے تین ڈھیریاں بنائیں اور کہا کہ یہ ڈھیری تو جنگل کا بادشاہ ہونے کی حیثیت سے میری ہے۔ اور یہ دوسری اس لئے میری ہے کہ شکار میں برابر کا حصہ دار ہوں۔ اب رہی یہ تیسری ڈھیری۔ کسی میں ہمت ہے تو اُٹھالے۔ ہے ہمت؟

ہر متحدہ محاذ میں عموماً ایک شیر اور باقی گدھے ہوتے ہیں تقسیم شکار کی ہو یا ٹکٹوں کی، اس میں شیر کا حصّہ خاص ہوتا ہے۔ اس پر کوئی اعتراض کرتا ہے تو گدھا ہے۔

مینڈکوں کا بادشاہ

ایک بار مینڈکوں نے خدا سے دُعا کی کہ یا پروردگار ہمارے لئے کوئی بادشاہ بھیج۔ باقی سب مخلوقات کے بادشاہ ہیں۔ ہمارا کوئی بھی نہیں ہے۔

خداوند نے ان کی سادہ لوحی پر نظر کرتے ہوتے لکڑی کا ایک کندہ جوہڑ میں پھینکا۔ بڑے زوروں کے چھینٹے اڑے۔ پہلے تو سب ڈر گئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ دیکھ کر کہ وہ لمبا لمبا پڑا ہے ڈرتے ڈرتے قریب آئے پھر اس پر چڑھ گئے اور ٹاپنے لگے۔

چند دن بعد دوبارہ خداوند کو عرضی دی کہ یہ بادشاہ ہمیں پسند نہیں آیا۔ کوئی اور بھیج جو ہمارے شایانِ شان ہو۔

خداوند نے ناراض ہوکر ایک سمندری سانپ بھیج دیا۔ وہ آتے ہی بہتوں کو چٹ کر گیا۔ باقی کونوں کُھدروں میں جا چھپے۔

اس حکایت کا نتیجہ قارئین کرام آپ خود ہی نکالیے۔ آخر آپ خود بھی سمجھ دار ہیں۔

بیان جانوروں کا

بیان پالتو جانوروں کا

بھلا ایسا بھی کوئی گھر ہے جس میں ایک نہ ایک پالتو جانور نہ ہو۔ گائے نہیں تو بھینس۔ بھیڑ نہیں تو بکری۔ کتا نہیں تو بلی۔ گھوڑا نہیں تو گدھا۔ جانور پالنا بڑی اچھی بات ہے۔ یہ صرف انسان کا خاصہ ہے۔ آپ نے یہ کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ کسی طوطے نے خرگوش پالا ہو، کسی مرغی نے کوئی بلی پالی ہو، یا کسی گدھے نے کوئی گھوڑا پالا ہو۔ گدھا بظاہر کیسا بھی نظر آئے ایسا گدھا کبھی نہیں ہوتا۔

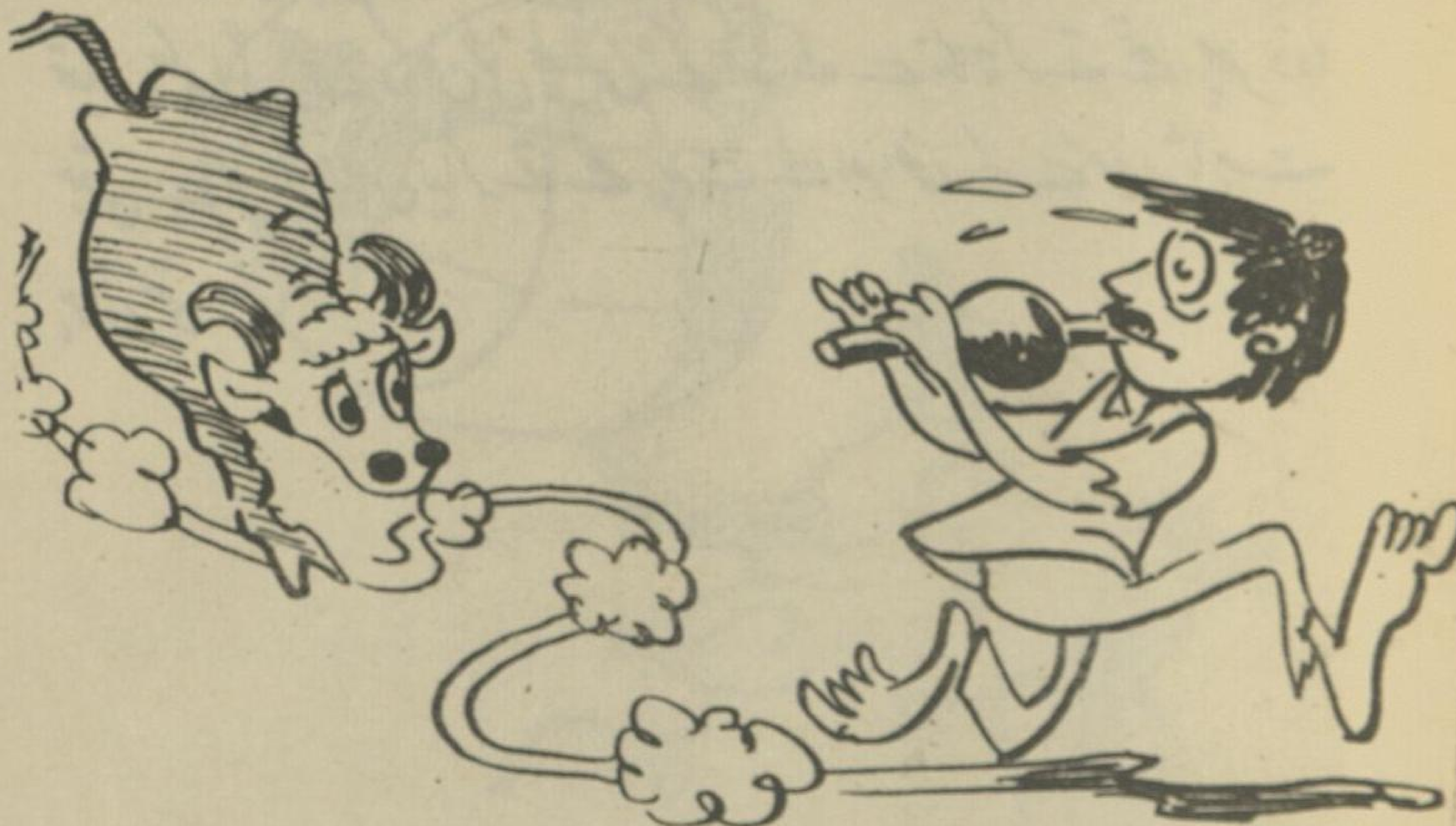
پالتو جانوروں کی چار قسمیں ہیں :

پہلی قسم : دُودھ دینے والے جانور، مثلاً گائے، بھینس، بکری وغیرہ

دوسری : دُودھ پینے والے جانور مثلاً بلی۔ کبھی سامنے کبھی چوری چھپے۔

تیسری قسم : جو نہ دودھ دیتے ہیں نہ دودھ پیتے ہیں : مثلاً مرغی، مثلاً کبوتر۔ مثلاً طوطا۔

چوتھی قسم ہم بھول گئے ہیں لہذا اسے نظر انداز کرتے ہیں اور تھوڑا تھوڑا حال ان جانوروں کا لکھتے ہیں۔



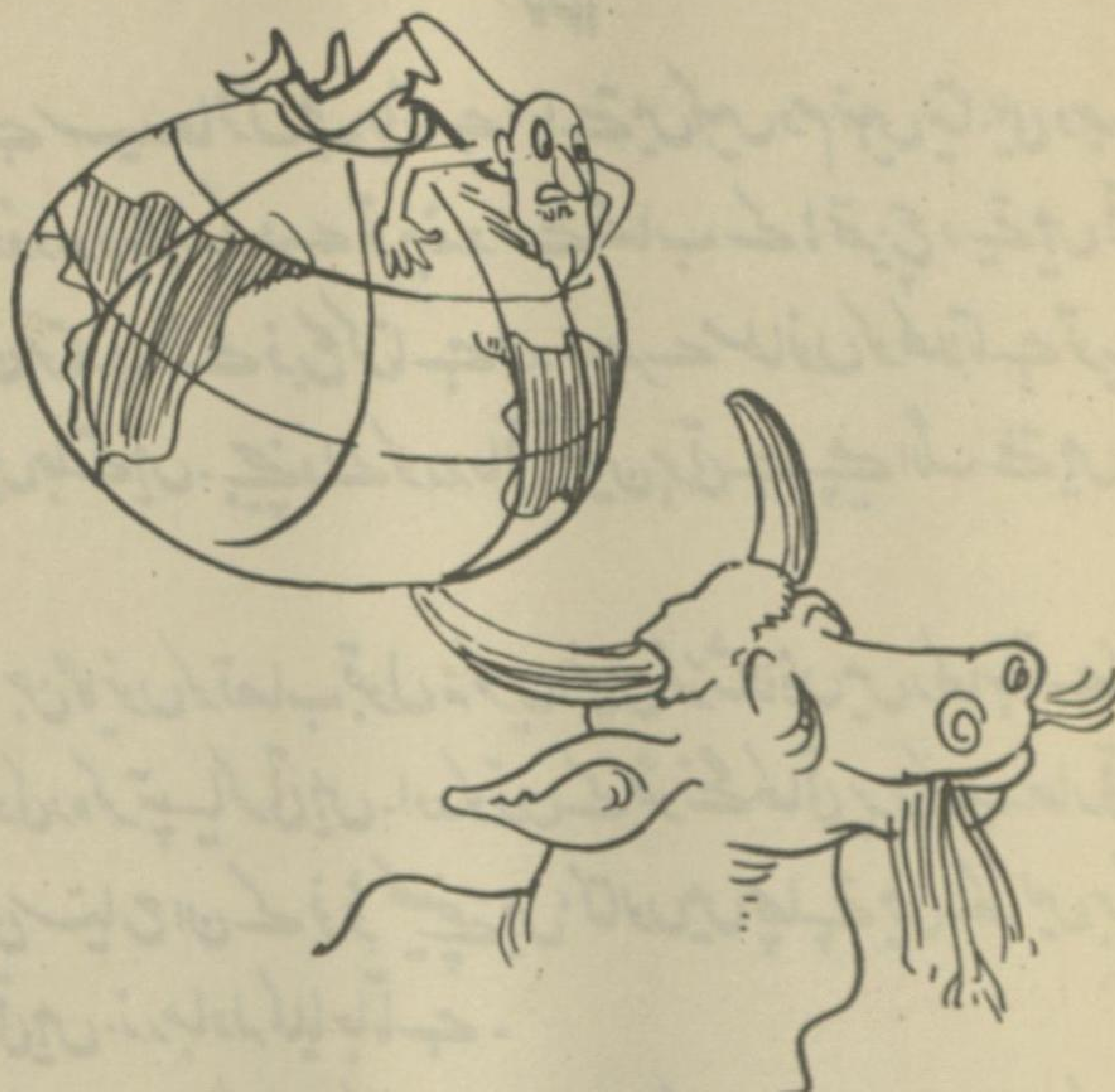
بھینس

یہ بہت مشہور جانور ہے۔ قد میں عقل سے تھوڑا بڑا ہوتا ہے۔ چوپایوں میں یہ واحد جانور ہے کہ موسیقی سے ذوق رکھتا ہے۔ اسی لئے لوگ اس کے آگے بین بجاتے ہیں۔ کسی اور جانور کے آگے نہیں بجاتے۔

بھینس دودھ دیتی ہے لیکن وہ کافی نہیں ہوتا۔ باقی دُودھ گوالا دودھ والا دیتا ہے اور دونوں کے باہمی تعاون سے ہم شہریوں کا کام چلتا ہے۔ تعاون اچھی چیز ہے لیکن دُودھ کو چھان لینا چاہیئے تاکہ مینڈک نکل جائیں۔

بھینس کا گھی بھی ہوتا ہے۔ بازار میں ہر جگہ ملتا ہے۔ آلوؤں، چربی اور وٹامن سے بھرپور۔ نشانی اس کی یہ ہے کہ پیپے پر بھینس کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل میں نہ جانا چاہئے۔

آج کل بھنیسیں انڈے نہیں دیتیں ۔ مرزا غالب کے زمانے کی بھنیسیں دیتی تھیں ۔ حکیم لوگ پہلے روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکالا کرتے تھے ۔ پھر دُوا جتنی ہے کُل بھی نکال لیا کرتے تھے ۔ بہت سے امراض کے لئے مفید ثابت ہوتی تھی ۔



گائے

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

یہ شعر مولوی اسمٰعیل میرٹھی کا ہے۔ شیخ سعدیؒ وغیرہ کا نہیں۔ یہ بھی خوب جانور ہے۔ دودھ کم دیتی ہے۔ عزت زیادہ کراتی ہے۔ پرانے خیال کے ہندو اسے ماتا جی کہہ کر پکارتے ہیں۔ ویسے بچھڑوں سے بھی اس کا یہی رشتہ ہوتا ہے۔

صحیح الخیال ہندو گائے کا دودھ پیتے ہیں، اس کے گوبر سے چوکا لیپتے ہیں لیکن اس کو کاٹنا اور کھانا پاپ سمجھتے ہیں۔ ان کے عقیدے میں جو گائے کو کاٹتا ہے، اور

کھاتا ہے سیدھا نرک میں جاتا ہے، راستے میں کہیں دم نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ گئے دُودھ دینا بند کر دے تو ہندو اسے قصاب کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ قصاب مسلمان ہوتا ہے اُسے ذبح کرتا ہے اور دوسرے مسلمانوں کو کھلاتا ہے تو یہ سارے نرک میں جاتے ہیں۔ بیچنے والے کو روحانی تسکین ہوتی ہے، پیسے الگ ملتے ہیں۔

جن گائیوں کو قصاب قبول نہ کریں انھیں گئوشالاؤں میں رکھا جاتا ہے، جہاں وہ بھوکی رہ کر تپسیا کرتی ہیں۔ اور کوّوں کے ٹھونگے کھاتی پر لوک سدھارتی ہیں۔ غیر ملکی سیاح ان کے فوٹو کھینچتے ہیں، کتابوں میں چھاپتے ہیں۔ کھالیں برآمد کی جاتی ہیں۔ زرِ مبادلہ کمایا جاتا ہے۔

شاستروں میں لکھا ہے کہ دنیا گائے کے سینگوں پر قائم ہے۔ گائے خود کس چیز پر کھڑی ہے۔ اس کا گوبر کہاں گرتا ہے اور پیشاب کہا جاتا ہے۔ یہ تفصیلات بخوفِ طوالت شاستروں میں نہیں لکھیں۔

بھیڑ

بھیڑ کی کھال مشہور ہے، بھیڑ کی چال مشہور ہے اور بھیڑ کا مآل بھی مشہور ہے بہت کم بھیڑیں عمر طبعی کو پہنچتی ہیں۔

جو رشتہ شیر بکری سے ہم نے بیان کیا ہے وہی بھیڑ کا بھیڑیے سے ہے بھیڑیں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ سفید بھیڑیں، کالی بھیڑیں وغیرہ۔ لیکن بھیڑیا سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے اور یکساں چاہت سے لقمہ بناتا ہے۔

اس جانور میں قربانی کا مادہ بہت ہوتا ہے اور انسان اس مادے سے بہت فائدہ اٹھاتا ہے۔ گوشت کھاجاتا ہے، کھال بیچ دیتا ہے۔



عرض کیا ہے ......

بکری

گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی، لیکن دودھ یہ بھی دیتی ہے۔ عام طور پر صرف دُودھ دیتی ہے لیکن زیادہ مجبور کریں تو کچھ مینگنیاں بھی ڈال دیتی ہے۔

جن بکریوں کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ ملی ہے۔ ان میں ایک گاندھی جی کی بکری تھی اور ایک اخفش نامی بزرگ کی۔ روایت ہے کہ وہ بکری نہیں بکرا تھا، معقول صورت۔ یہ جو شاعری میں اوزان اور بحروں کی بدعت ہے۔ یہ اخفش صاحب ہی سے منسوب کی جاتی ہے۔ بیٹھے فاعلاتن فاعلات کیا کرتے تھے جہاں شک ہو تصدیق کے لئے بکرے سے پوچھتے تھے کہ کیوں حضرت ٹھیک ہے نا؟ وہ بکرا اللہ اُسے جنت میں یعنی جنت والوں کے پیٹ میں جگہ دے، سر ہلا کر ان کی بات پر صاد کر دیتا تھا۔ اس بکرے کی نسل بہت پھیلی، پاکستان میں بھی پائی جاتی ہے۔ سوتے جاگتے اس کے منہ سے یس سر، یس سر، جی حضور، جی جناب، بجا فرمایا وغیرہ نکلتا رہتا ہے۔ اسے بات سننے اور سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

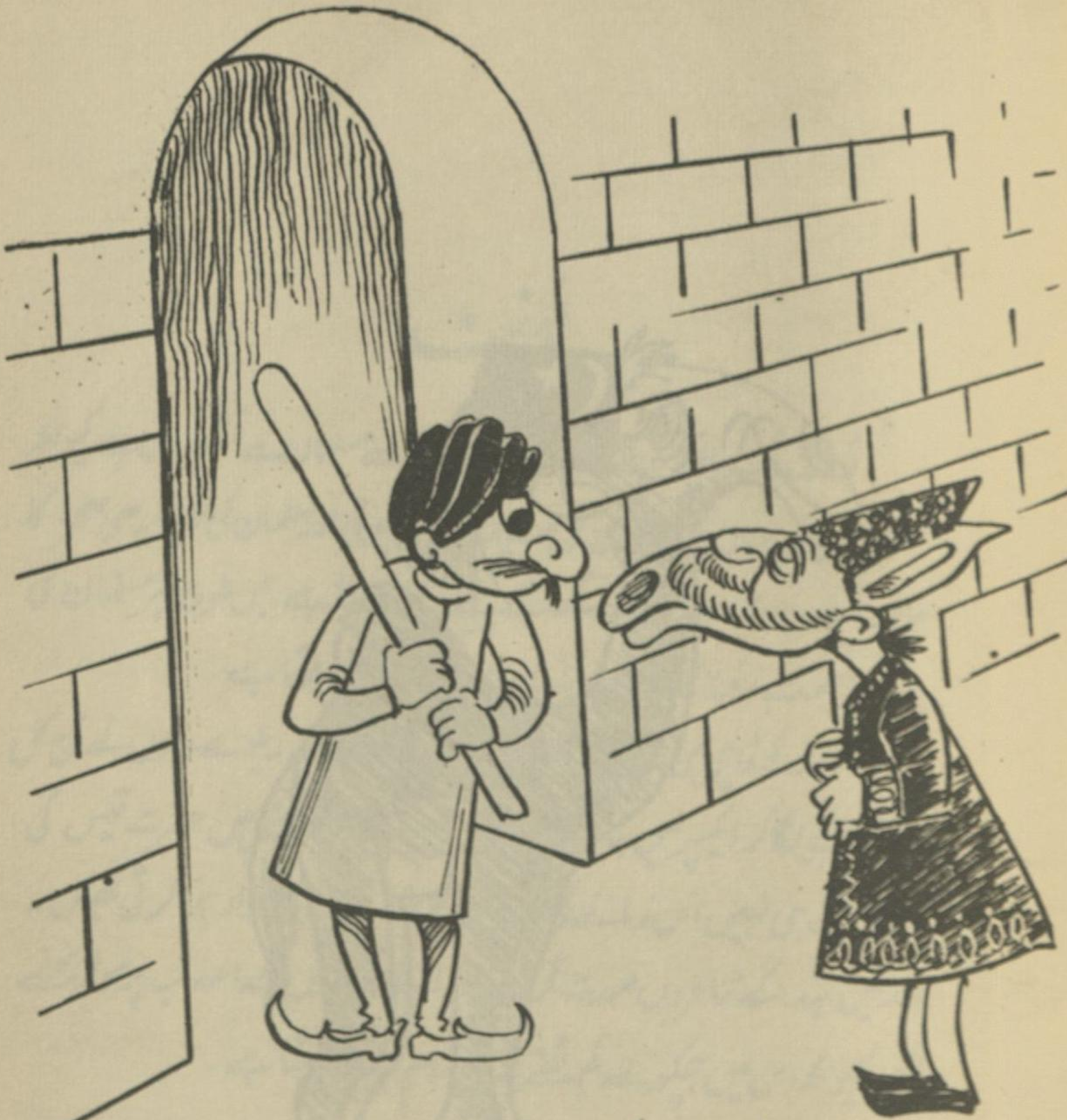
جن ملکوں میں بہت انصاف ہو ان میں شیر اور بکریاں ایک گھاٹ پانی پینے لگتی ہیں، جس طرح علامہ اقبال کے ایک شعر میں محمود اور ایاز ایک صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ شیر پانی پینے کے بعد وہیں بکری کو دبوچ لیتا ہے، اُسے ناشتے کے لئے زیادہ دُور نہیں جانا پڑتا۔

گدھا

گدھا بڑا مشہور جانور ہے۔ گدھے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ چار پاؤں والے، دو پاؤں والے۔ سینگ ان میں سے کسی کے سر پر نہیں ہوتے۔ آج کل چار پاؤں والے گدھوں کی نسل گھٹ رہی ہے۔ دو پاؤں والوں کی بڑھ رہی ہے۔

گھوڑے کی شکل ایک حد تک گدھے سے ملتی ہے۔ بعض لوگ گدھے گھوڑے کو برابر سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ دونوں کو ایک تھان پر باندھتے ہیں یا ایک لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر گدھا اس پر اعتراض کرے تو کہتے ہیں سنو ذرا اس گدھے کی باتیں۔ سوچنے کی بات ہے اگر گھوڑا کسی لائق ہوتا تو حضرت عیسیٰؑ اس پر سواری نہ کرتے، گدھے کو کیوں پسند کرتے؟ شاعروں نے بھی گدھے کی ایک خوبی کی تعریف کی ہے۔ خرِ عیسیٰ ہو یا کوئی اور گدھا اگر وہ مکہ بھی ہو آئے تو گدھا ہی رہتا ہے۔ دوسرے جانور بشمول آدمی تو اپنی اصل بھول جاتے ہیں واپس آکر القاب کے دُم چھلّے لگاتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے ایک زمانے میں گدھوں کی مشابہت گھوڑوں کی بجائے آدمیوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ غالب اپنے محبوب کے دروازے پر کسی کام سے گئے تھے اس کا پاسبان یعنی دربان ان کو حضرت عیسیٰ کی سواری کا جانور سمجھ کر بوجہ احترام چُپ رہا لیکن جب انھوں نے کنوتیاں جھاڑ کر اس کے قدم لینے کی کوشش کی تو سمجھ گیا کہ یہ تو نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر ہیں۔ چنانچہ کماحقہ بدسلوکی کی۔



گدھا سمجھ کے وہ چپ تھا .....

سوالات

۱- کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے؟ اگر نہیں ہوتے تو یہاں سے بھیجے جائیں؟ اگر ہوتے ہیں تو وہاں سے منگاتے جائیں؟

۲- گدھوں کی طرح ہمارا منہ مت دیکھو۔ جواب دو۔



اُونٹ

اُونٹ ایک جانور ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اُسے مسلمان سے تشبیہ دی ہے کیونکہ مسلمان کی طرح اس کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی اور مسلمان کی طرح یہ بھی صحرا کا جانور ہے۔ بہت دن تک بے کھائے پیئے زندہ رہتا ہے۔ جس طرح ہر مسلمان کی پیٹھ پر عظمتِ رفتہ کا کوہان ہوتا ہے اس کی پیٹھ پر بھی ہوتا ہے۔

اُونٹ کو ڈاچی بھی کہتے ہیں۔ ڈاچی والیا موڑ مہار وے۔ ریلوے والوں نے آج کل اس کو پہیئے لگا کر ایکسپریس بنا دیا ہے۔ عربی میں اسے ناقہ کہتے ہیں حضرت قیس کی محبوبہ لیلےٰ ہی نہیں اس زمانے کی سبھی عورتیں ناقے پر ہی سوار ہوا کرتی تھیں۔ بعد میں ہند کے شاعروں صورت گروں اور افسانہ نویسوں کے اعصاب پر سوار ہونے لگیں کیونکہ اس میں ہچکولے کم لگتے ہیں۔ آرام زیادہ رہتا ہے۔

سوالات

۱۔ اونٹ کو صحرا کا جہاز کہتے ہیں کیا اسی مثال پر ہم جہازوں کو سمندر کے اونٹ کہہ سکتے ہیں؟

کتّا

کتّا پالتو جانور ہے۔ ہمارے شہر کی کارپوریشن اسے پالتی ہے اور مختلف علاقوں میں چھوڑ دیتی ہے۔ کارپوریشن اور بھی کئی جانور پالتی ہے مثلاً مچھر، مثلاً چوہے۔ لیکن بھونکنے والا جانور یہی ہے۔ کتابوں میں آیا ہے کہ جو کتّے بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں۔ کاٹنے والے کو بھونکنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بھونکتا وہ ہے جسے کاٹا جائے، جس کو گزند پہنچے۔

کتّا بڑا وفادار جانور ہے۔ کارپوریشن بھی اس کی بہت وفادار ہے۔ جن دنوں میں کتّے شہریوں کو کاٹتے ہیں، کارپوریشن بھی ان کی ہمدردی میں کاٹنا شروع کر دیتی ہے کہ یہ ٹیکس لاؤ۔ وہ ٹیکس لاؤ۔ ناطقے کے علاوہ کبھی کبھی پانی بھی بند کر دیتی ہے جس سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ کارپوریشن کا شجرہ حضرت امام حسین کے کسی صاحبِ اقتدار ہمعصر سے جا ملتا ہے۔

کارپوریشن کے علاوہ نجی شعبے میں بھی کتّے ہوتے ہیں۔ رئیسوں کے کتّے رئیس ہوتے ہیں، غریبوں کے کتّے غریب ہوتے ہیں۔ رئیسوں کے کتّے غریبوں پر بھونکتے ہیں۔ غریبوں کے کتّے اپنے آپ پر بھونکتے ہیں

کتّا اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے عین اس طرح جس طرح شیر کسی دوسرے کی گلی میں

کتا بن جاتا ہے۔

کتوں اور عاشقوں میں کئی چیزیں مشترک ہیں۔ دونوں راتوں کو گھومتے ہیں، اور اپنا کلام پڑھ پڑھ کر لوگوں کو جگاتے ہیں اور اینٹ پتھر کھاتے ہیں۔ ہاں ایک کتا لیلےٰ کا بھی تھا۔ لوگ لیلےٰ تک پہنچنے کے لئے اس سے پیار کرتے تھے۔ اس کی خوشامد کرتے تھے جس طرح صاحب کے سکریٹری یا چپراسی کی کرنی پڑتی ہے۔

۱۲ مئی ۱۹۷۰ء



آدمی

دودھ دینے والے جانوروں میں پالنے کے لئے سب سے اچھا یہی ہے۔ یہ نوکری کرتا ہے، دکان کرتا ہے، تنخواہ لاتا ہے، بچے کھلاتا ہے، انھیں پیٹھ پر بٹھاتا ہے۔ عجیب شکلیں بنا کر ہنساتا ہے، بہلاتا ہے۔ اپنی مادہ کی خدمت میں جتنی دوڑ دھوپ یہ کرتا ہے کوئی اور جانور نہیں کرتا۔ اسی لئے تو اس کے سینگ غائب ہو گئے ہیں، کھُر گھس گئے ہیں اور دُم جھڑ گئی ہے۔

اس جانور کا پالنا اور سدھانا سب سے آسان ہے۔ اسے طوطے کی طرح بولنا بھی سکھا سکتے ہیں۔ ایک آسانی یہ ہے کہ گھر میں اس کے لئے الگ تھان یا پنجرہ بنانے یا زنجیر ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس کمرے میں چاہو سُلا دو۔ بھاگتا نہیں۔

سوالات

۱۔ تم اپنا شمار پالتوؤں میں کرنا پسند کروگے یا جانوروں میں؟

۲۔ اونٹ کو مسلمانوں سے کیوں تشبیہ دیتے ہیں؟

ا: کوئی کل سیدھی نہ ہونے کی وجہ سے؟

ب: بلا کھائے پیئے بہت دن زندہ رہنے کی وجہ سے؟

شیر

شیر آئے، شیر آئے، دوڑنا!
آج کل ہر طرف شیر گھوم رہے ہیں،
دھاڑ رہے ہیں۔
یہ شیرِ بنگال ہے!
یہ شیرِ سرحد ہے!!
یہ شیرِ پنجاب ہے!!!
لوگ بھیڑیں بنے اپنے باڑوں میں دبکے ہوئے ہیں۔
بابا حفیظ جالندھری کا شعر پڑھ رہے ہیں:
"شیروں کو آزادی ہے
آزادی کے پابند رہیں
جس کو چاہیں، چیریں پھاڑیں
کھائیں پیئیں، آنند رہیں"
شیر یا تو جنگل میں ہوتے ہیں،
یا چڑیا گھر میں!
یہ ملک یا تو جنگل ہے،



یا چڑیا گھر ہے !
یا پھر قالین ہوگا،
کیونکہ ایک قسم شیر کی شیر قالین بھی ہے ۔
یا پھر کاغذ ہوگا ،
کیونکہ ایک شیر کاغذی شیر بھی ہوتا ہے
یا پھر یہ جانور کچھ اور ہیں
آگا شیر کا ، پیچھا بھیڑ کا
ہمارے ملک میں یہ جانور عام پایا جاتا ہے ۔

شیر جنگل کا بادشاہ ہے
لیکن اب بادشاہوں کا زمانہ نہیں رہا
اس لئے شیروں کا زمانہ بھی نہیں رہا
آج کل شیر اور بکریاں ایک گھاٹ پانی نہیں پیتے۔
بکریاں سینگوں سے کھدیڑ بھگاتی ہیں۔
لوگ باگ ان کی دُم میں نمدہ باندھتے ہیں۔

شکاری شیروں کو مار لاتے ہیں،
اُن کے سر دیواروں پہ سجاتے ہیں،
ان کی کھال فرش پہ بچھاتے ہیں،
اُن پر جوتوں سمیت دندناتے ہیں،
لوگوں کو فخر سے دکھلاتے ہیں،

مرے شیر تجھ پر بھی رحمت خدا کی
تو بھی وعظ مت کہ
اپنی کھال میں رہ!

۲۳، فروری ۱۹۷۰ء

احوال چند پرندوں کا



طوطا

طوطا بڑا خوبصورت جانور ہے۔ بعض طوطوں میں انسان کی بعض خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً آنکھیں پھیر لینا خصوصاً مطلب نکل جانے کے بعد۔ طوطے آپس میں ایسے طوطے کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ کیسا انسان چشم واقع ہوا ہے۔

طوطا بہت فصیح البیان جانور ہے، لیکن اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ جو کچھ اس کا مالک یا چوگا دینے والا سکھاتا ہے وہی یہ کہتا ہے۔ پیارے بڑو۔ آج کل ہمارے ہاں بھی طوطوں کی بھرمار ہے۔ طرح طرح کی بولیاں سننے میں آرہی ہیں۔ کبھی کان دھر کر سنو، یہ کیا کہتے ہیں، اور اس سے ان کے سکھانے پڑھانے اور چوگا دینے والوں کا سراغ لگانے کی کوشش کرو۔

طوطے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ جنگلی طوطے۔ جو جنگل میں رہتے ہیں۔ پالتو طوطے جو پنجروں میں رہتے ہیں۔ فالتو طوطے جنھیں جنگل میسر ہے نہ پنجرہ۔ آئے دن ان کی وطنیت کا سوال اٹھتا ہے۔ اور آخری قسم ہے ہاتھوں کے طوطے ان کے متعلق اب تک یہی معلوم ہو سکا ہے کہ اُڑ جایا کرتے ہیں۔

طوطا فال کا لفافہ لاتا ہے۔ قسمت کا حال بتاتا ہے۔ کبھی کبھی توپ بھی چلاتا ہے۔ ایسے طوطوں کی تصویریں اکثر دولہا دلہن کے کالم میں چھپتی ہیں۔

کبوتر

کبوتر بڑے کام کا جانور ہے۔ یہ آبادیوں میں، جنگلوں میں، مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی کتابوں میں، غرضیکہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ کبوتر کی دو بڑی قسمیں ہیں: نیلے کبوتر، سفید کبوتر۔ نیلے کبوتر کی بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ سفید کبوتر بالعموم سفید ہی ہوتا ہے۔

کبوتروں نے تاریخ میں بھی بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ شہزادہ سلیم نے مسماۃ مہرالنسا کو جب کہ وہ ابھی بے بی نورجہاں تھیں، کبوتر ہی تو پکڑایا تھا جو اُس نے اڑادیا اور پھر ہندوستان کی ملکہ بن گئی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس سارے قصے میں زیادہ فائدے میں کون رہا؟ شہزادہ سلیم؟ نورجہاں؟ یا وہ کبوتر؟ رعایا کا فائدہ ان دنوں کبھی معرضِ بحث میں نہ آتا تھا۔

پرانے زمانے کے لوگ عاشقانہ خط و کتابت کے لئے کبوتر ہی استعمال کرتے تھے۔ اس میں بڑی مصلحتیں تھیں۔ بعد میں آدمیوں کو قاصد بنا کر بھیجنے کا رواج ہوا تو بعض اوقات یہ نتیجہ نکلا کہ مکتوب الیہ یعنی محبوب، قاصد ہی سے شادی کر کے بقیہ عمر ہنسی خوشی بسر کر دیتا تھا۔ چند سال ہوتے ہمارے ملک کی حزبِ مخالف نے ایک صاحب کو الٹی میٹم دے کر والیٔ ملک کے پاس بھیجا تھا۔ الٹی میٹم تو راستے میں کہیں رہ گیا۔ دوسرے روز ان صاحب کے وزیر بننے کی خبر اخباروں میں آ گئی۔ کسی طوطے کے ہاتھ پیغام بھیجا جاتا تو یہ صورتِ حال پیش نہ آتی۔



کوّا

کوّے ہیں سب دیکھے بھالے۔ چونچ بھی کالی پَر بھی کالے۔ یہ سبھی ملکوں میں ہوتے ہیں سوائے جنوبی افریقہ کے اور امریکہ کی جنوبی ریاستوں کے۔ وہاں صرف سفید کوّوں کو پسند کیا جاتا ہے اور سفید کوّے اتفاق سے ہوتے ہی نہیں۔

کوّا حلال بھی ہوتا ہے لیکن صرف آغا تقی کے باغ میں۔ سُنا ہے کراچی میں بھی ریڑھیوں پر کوّوں کا سوپ ملتا ہے، لوگ بڑے شوق سے پیتے ہیں۔ اپنے رنگ کی رعایت سے یہ بلیک مارکیٹ کے دام پاتا ہے۔ عرف عام میں (یہ سوپ) مرغی کا کہلاتا ہے۔

بٹیر

یہ ایک جانور ہے جو کھانے میں بہت لذیذ ہوتا ہے۔ اندھے کے ہاتھ ویسے ہی آجاتی ہے۔ آنکھوں والے کے لئے اس کا بغیر جال کے پکڑنا مشکل ہے۔

پہلے زمانے کے بٹیر بڑے باکمال ہوتے تھے۔ صف شکن نامی ایک بٹیر لکھنؤ کے ایک نواب صاحب کے پاس تھا۔ نماز بھی پڑھتا تھا، ہُو حق بھی کرتا تھا۔ تیر اندازی بھی جانتا تھا۔ یقیناً گھڑ سواری کا بھی ماہر ہوگا۔ افیم بھی کھاتا تھا۔ ان سارے کمالات کے باوجود اُسے ایک روز بلی لے گئی۔ چالیس دن صف ماتم بچھی رہی۔

تیتر

یہ جانور خالص بہت کم ملتا ہے۔ عام طور پر جو جانور ملتا ہے وہ آدھا تیتر آدھا بٹیر ہوتا ہے۔

تیتر بڑا ہشیار پرندہ ہے۔ ایک بار ایک مولوی صاحب، ایک کنجڑا اور ایک پہلوان کہیں جا رہے تھے۔ یہ اس قسم کی ان مل بے جوڑ بات حکایات ہی میں ممکن ہے۔ خیر ایک جگہ تیتر بولا۔ مولوی صاحب نے کہا دیکھو کتنا اچھا جانور ہے، کہتا ہے "سبحان تیری قدرت"۔ کنجڑے نے کہا جی نہیں۔ کہہ رہا ہے "لہسن، میتھی، ادرک"۔ پہلوان نے ڈنڈ پھلا کر کہا۔ "بادشاہو - ایہہ گل نئیں۔ یہ کہہ رہا ہے۔ کھا گھی کر کسرت"۔ اس پر بحث ہوئی۔ بحث سے تکرار ہوئی۔ تکرار سے پیا ڈکی ہوئی۔ تیتر کا کچھ نہیں بگڑا

معری ایک شاعر پرانے زمانے میں تھا۔ ایک شخص نے اُسے بھُونا ہوا تیتر بھیجا۔ اس نے دیکھ کر فلسفہ بگھارنا شروع کر دیا کہ ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔ ہم ہوتے تو فوراً چٹ کر جاتے بلکہ کہتے کہ ایک پلیٹ اور لاؤ۔ معری ویسے بھی گوشت نہ کھاتا تھا۔ شاید اس زمانے میں بھی بارہ روپے سیر ملتا ہوگا۔

گوشت نہ کھانے والا ہر شاعر معری نہیں ہوتا۔ بعض مہنگا ہونے کی وجہ سے نہیں کھاتے۔



بیا

بیے کو زیادہ تر لوگ اس کے گھونسلے کی وجہ سے جانتے ہیں۔ یہ لمبوترا سا ہوتا ہے۔ اس کے اندر وہ رہتا ہے اور انڈے دیتا ہے۔ اس گھونسلے کی تعمیر کو اب تک بڑا کمال گنا جاتا تھا۔ آج کل تو ہمارے ہاں کی عورتیں بھی بنا لیتی ہیں۔ لیکن نہ وہ اس کے اندر رہتی ہیں نہ اس میں انڈے دیتی ہیں۔ بس اُٹھا کر سر پہ رکھ لیتی ہیں۔

پدّی

یہ بھی ایک جانور ہوتا ہے جس کا شوربا مشہور ہے۔ اس کا شوربا تھوڑا ہوتا ہے لیکن ہوتا ضرور ہے۔ محاورے کے لئے بہر حال کافی ہے۔

اُلّو

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔ اُلّو ہمارے معاشرے میں بہت مقبول ہے۔ آپ آئے دن سنتے ہیں کہ فلاں نے فلاں کو اُلّو بنایا۔ یا فلاں شخص اُلّو بن گیا۔ کبھی یہ نہ سنیں گے کہ کسی نے کسی کو کبوتر بنایا یا طوطا بنایا ہو۔

اُلّو کو لوگ زاہد و مرتاض خیال کرتے ہیں، اس لئے کہ درخت کی ٹہنی پر یا کسی کھوہ میں آنکھیں بند کئے بیٹھا رہتا ہے۔ کوئی چھوٹا موٹا جانور قریب آئے تو منہ کھول کر اُسے ہڑپ کر لیتا ہے، آنکھیں ایسی ہی بند رہتی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی کوئی شخص دنیا کے مسائل سے آنکھ بند کئے بیٹھا رہے اور اپنے خورد و نوش سے غافل نہ ہو تو بڑی عزت پاتا ہے۔ نیک گنا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں اُلّو بیوقوف کے معنوں میں آتا ہے۔ جبکہ مغربی ادب میں یہ حکمت و دانش کی مثال ہے۔ ہم اس باب میں اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں۔ اتنا جانتے ہیں کہ سمجھدار اور دانش مند اور دانش ور لوگ اکثر بھوکے مرتے دیکھے گئے ہیں۔ کوئی اُلّو کبھی بھوکا نہیں مرتا۔



بگلا

دیکھو کتنا بھلا جانور ہے۔ جو ہڑ کنارے ایک ٹانگ پر کھڑا ہے۔ عبادت میں مگن۔ نیکی میں غرق۔ نورِ رُخ نہ صرف چہرے پر برس رہا ہے بلکہ کچھ کچھ آس پاس بھی گر رہا ہے۔ ہندو اِسے بھگت بتاتے ہیں۔ بہت سے مسلمان بھی عقیدت جتلاتے ہیں۔

مچھلیوں اور مینڈکوں کی اس کے متعلق البتہ یہ رائے نہیں ہے۔ زیادہ واسطہ بھی اس سے انہی کو پڑتا ہے۔

پہلے زمانے میں بگلوں کی کوئی تنظیم نہ ہوتی تھی، اپنی اپنی جگہ کھڑے شکار مارا کرتے تھے اب ان کی باقاعدہ جماعتیں ہیں۔ تنظیم بڑی اچھی چیز ہے۔ یہ ہماری ذاتی رائے ہے۔ مینڈکوں اور مچھلیوں کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

بگلا سفید ہوتا ہے، کم از کم باہر کی طرف سے۔ اسے کھیر سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔ کھیر سیدھی ہو یا ٹیڑھی، بگلوں کا کسی نہ کسی صورت میں اس سے تعلق ضرور ہوتا ہے۔

بگلا پکڑنے کا طریقہ بہت آسان ہے۔ دبے پاؤں پیچھے جا کر اس کی آنکھ میں موم ٹپکا دو۔ جب اندھا ہو جائے تو پکڑ لو۔ بچ کر کہاں جائے گا۔ آج کل یہ طریقہ بگلا پکڑنے کے لئے کم اور کاروبار حکومت کے لئے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

۲۱، جون ۱۹۷۰ء

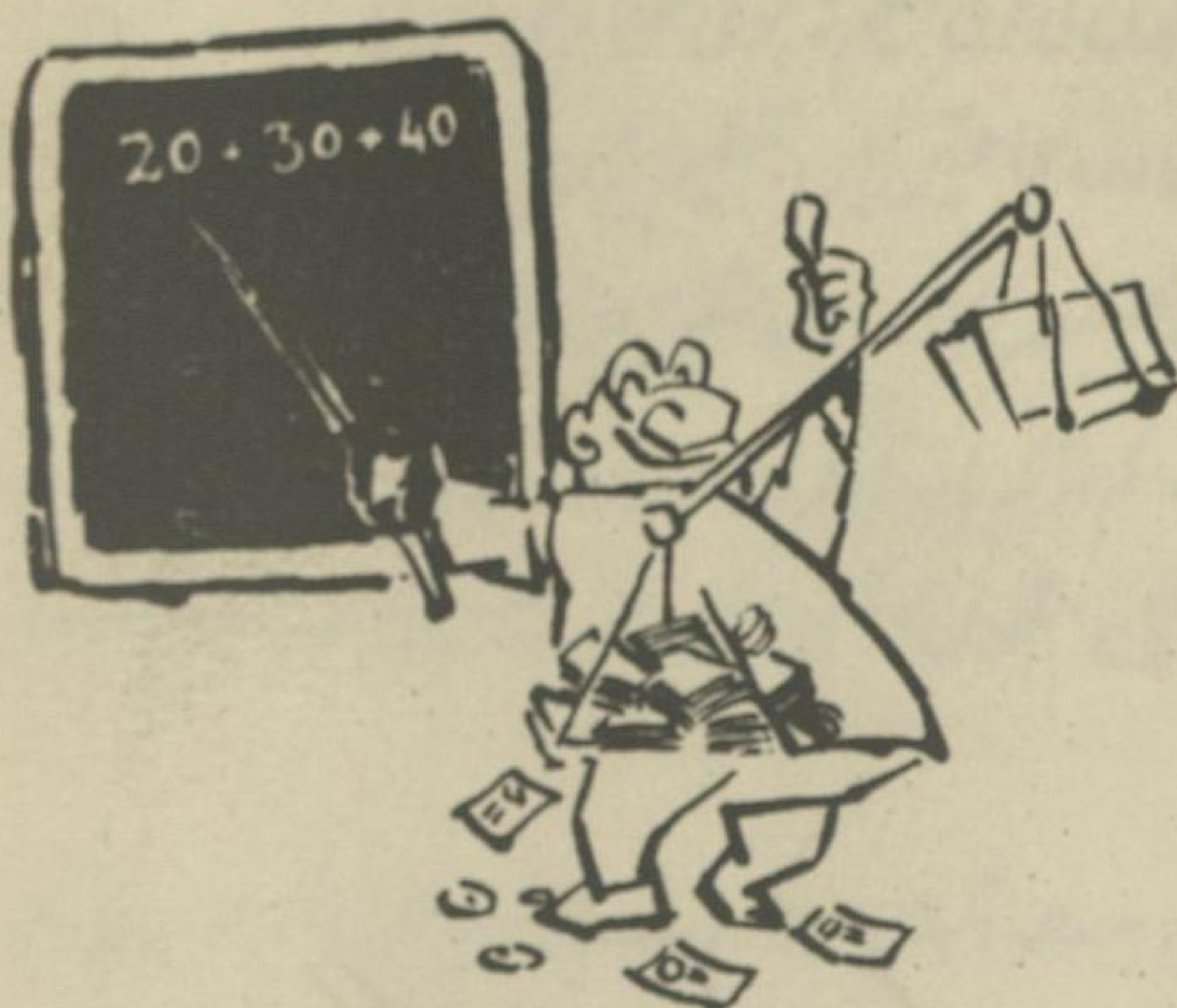
سوالات

۱۔ بٹیر ہمیشہ اندھے کو کیوں ہاتھ آتی ہے؟

۲۔ خاندان مغلیہ کی تاریخ میں کبوتر کی اہمیت پر جواب مضمون لکھو۔ کاغذ کے صرف دو طرف۔ تینوں طرف نہیں۔

۳۔ تم کبھی گنبد افراسیاب پر بیٹھے ہو اور نوبت بجائی ہے؟
اُلو دُں کی طرح ہمارا منہ مت دیکھو؟ جواب دو۔

گرد و پیش کی چیزیں



علم بڑی دولت ہے

علم بڑی دولت ہے
تو بھی اسکول کھول
علم پڑھا
فیس لگا
دولت کما

فیس ہی فیس
پڑھائی کے بیس

بس کے تیس
یونیفارم کے چالیس
کھیلوں کے الگ
ورائٹی پروگرام کے الگ
پکنک کے الگ

لوگوں کے چیخنے پر نہ جا
دولت کما
اس سے اور اسکول کھول
اُن سے اور دولت کما
کمائے جا، کمائے جا
ابھی تو تُو جوان ہے
یہ سلسلہ جاری ہے
جب تک گنگا جمنا ہے

(۲)

پڑھائی بڑی اچھی چیز ہے
پڑھ
بہی کھاتا پڑھ
ٹیلی فون ڈائرکٹری پڑھ

بنک اسٹیٹمنٹ پڑھ
ٹنڈر نوٹس پڑھ
ضرورت رشتہ کے اشتہار پڑھ

اور کچھ مت پڑھ
میرؔ اور غالبؔ مت پڑھ
اقبالؔ اور فیضؔ مت پڑھ
ابنِ انشا کو بھی مت پڑھ
ورنہ تیرا بیڑا پار نہ ہوگا
اور ہم میں سے کوئی
نتائج کا ذمہ دار نہ ہوگا

سوالات

۱۔ علم بڑی دولت ہے۔ لیکن جس کے پاس علم ہوتا ہے اس کے پاس دولت کیوں نہیں ہوتی اور جس کے پاس دولت ہوتی ہے اس کے پاس علم کیوں نہیں ہوتا؟

اخبار

"یہ کونسا اخبار ہے ؟"

"یہ روزنامہ باغ و بہار ہے ۔"

اس کی کیا بات ہے ؟

مجموعۂ معلومات ہے !

یہ لوگوں کو سیدھی راہ بھی بتاتا ہے ۔

طاقت کی اکسیری دوائیں بھی بکواتا ہے ۔

اس میں فلمی صفحہ بھی ہوتا ہے ۔

اس میں اسلامی صفحہ بھی ہوتا ہے ۔

غازیوں کی تکبیریں بھی ہوتی ہیں ۔

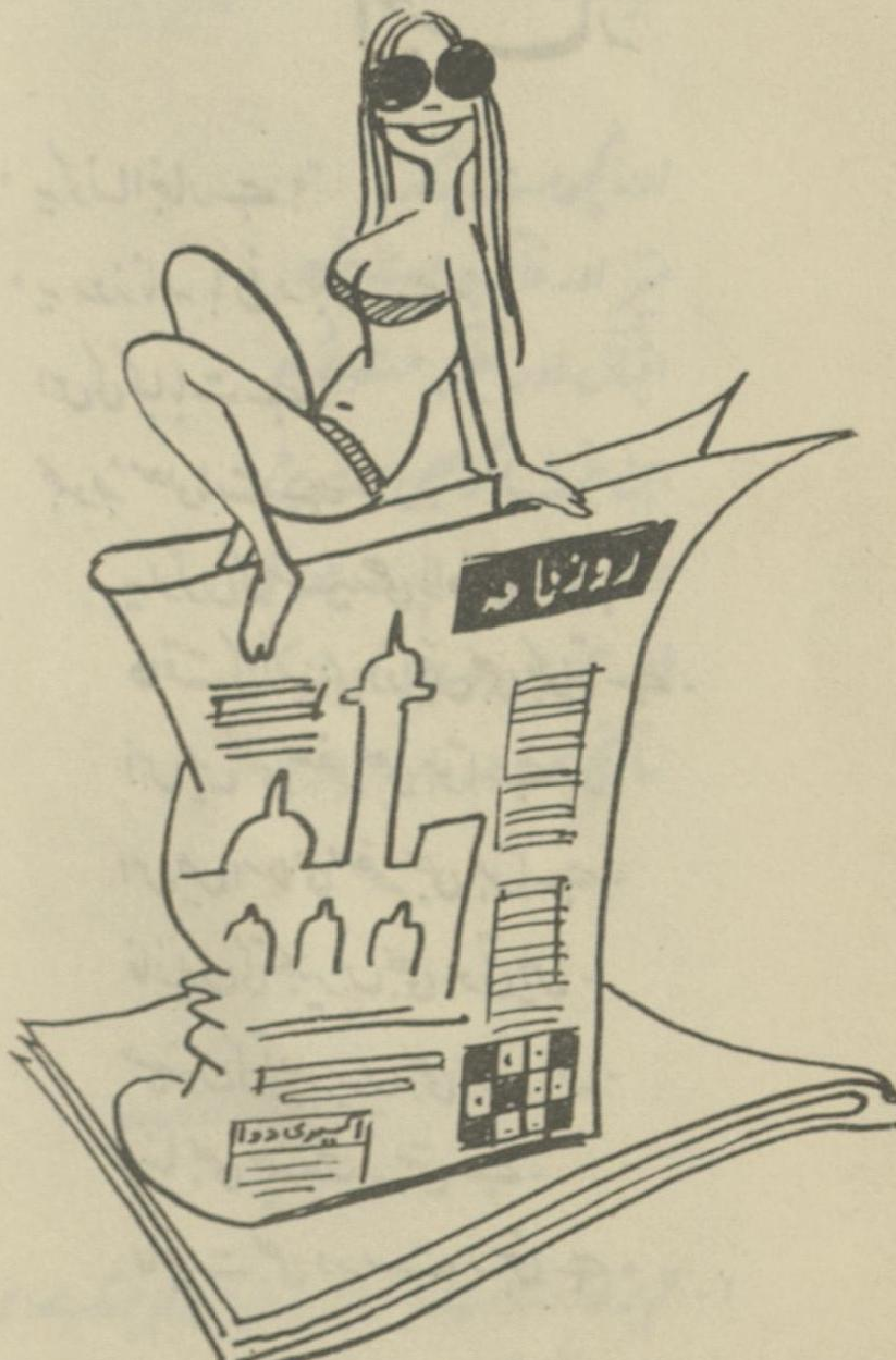
حسینوں کی تصویریں بھی ہوتی ہیں ۔

دُنیا بھی چُست رہتی ہے ۔

عاقبت بھی درست رہتی ہے ۔

اخبار کے بڑے فائدے ہیں

اخبار نہ ہو تو قوم کی رہنمائی کیسے ہو ؟



اس میں فلمی صفحہ بھی ہوتا ہے

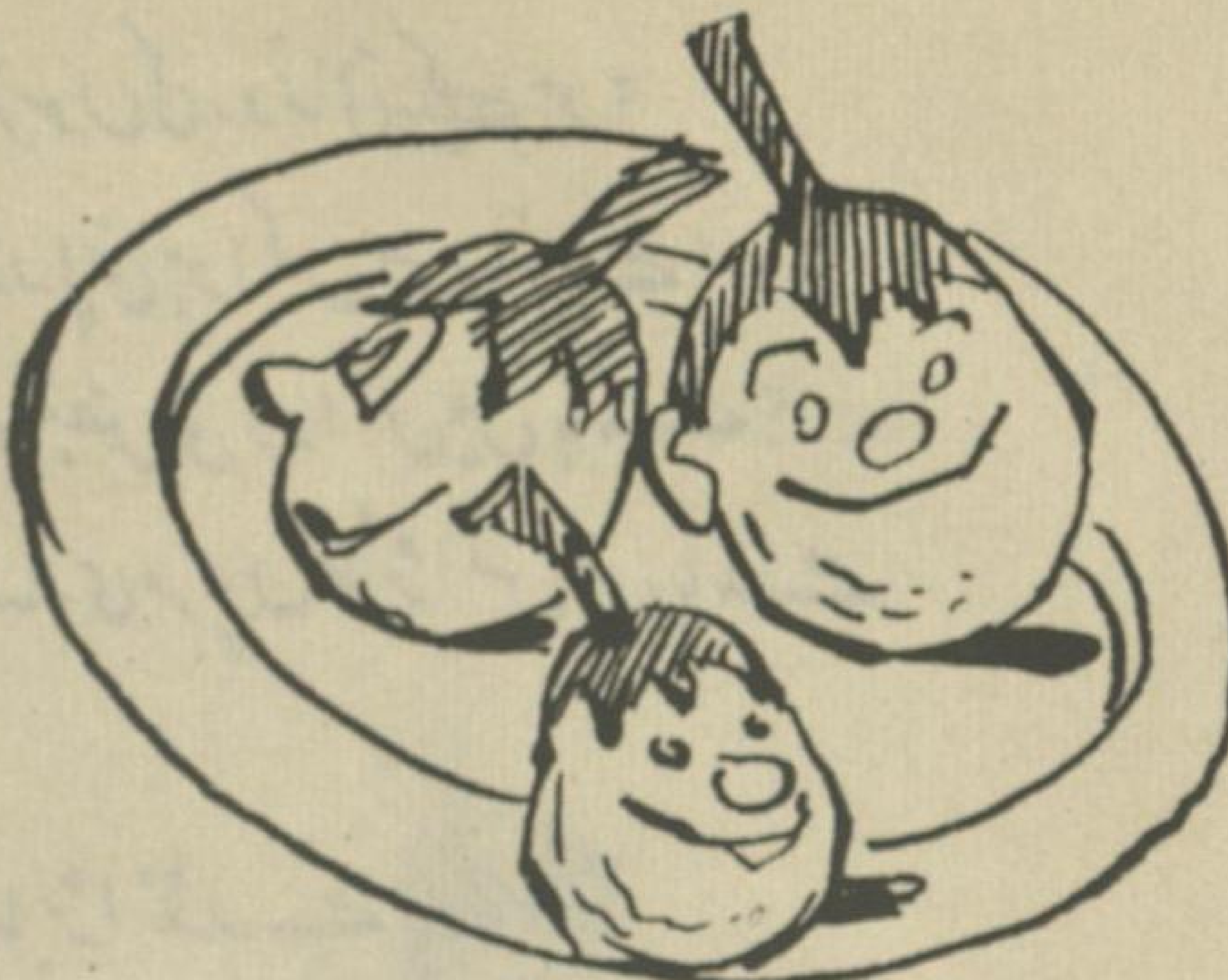
اس میں اسلامی صفحہ بھی ہوتا ہے۔

ایکٹرسوں کی رونمائی کیسے ہو؟
لیڈر اپنی ہوا کس میں باندھے؟
حکیم قبض کی دوا کس میں باندھے؟
پنساری مرچوں کا پُڑا کس میں باندھے

یہ اخبار والا بڑا نڈر ہے
باطل سے نہیں ڈرتا
لوگوں سے نہیں ڈرتا
کبھی کبھی خدا تک سے نہیں ڈرتا
بس سرکار سے ڈرتا ہے
بڑا اچھا کرتا ہے
جب تک خوشنودیِ سرکار ہے، اخبار ہے۔
روزگار ہے، کوٹھی اور کار ہے۔
پرانے لوگ ایسا نہیں کرتے تھے
پرانے لوگ بھوکے بھی تو مرتے تھے

پھر بھی میاں اخبار والے
اخبار کالا کر
اپنا کردار کالا مت کر
صرف اخبار بیچ —— ایمان مت بیچ

یکم دسمبر ۱۹۷۰



بینگن اور مولی وغیرہ

"یہ کیا ہے؟"

"یہ بینگن ہے"۔

"یہ کون سا بینگن ہے؟"

"یہ تھالی کا بینگن ہے۔ لڑھکتا رہتا ہے۔ تبھی تو ہر موسم میں تروتازہ رہتا ہے"۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ مولی ہے"۔

"یہ کس کھیت کی مولی ہے؟"

یہ ہر کھیت کی مولی ہے۔ کبھی اِس کھیت میں، کبھی اُس کھیت میں"۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ پالک ہے"۔

"یہ کیسی پالک ہے؟"

"یہ پہلے مالی کی بے پالک ہے۔"

"یہ پہلے مالی کو گالی کیوں دیتی ہے؟"

"فطرت سے مجبور ہے۔ یوں بھی آج کل گالی کا دستور ہے۔"



"یہ بینگن اچھے نہیں، یہ مولی اچھی نہیں۔ یہ پالک اچھی نہیں۔"

——— سبزی کا خیال چھوڑ

——— وٹامن سے منہ موڑ

——— مسوُر کی دال کھا

——— اپنے منہ پر نہ جا

سوالات

۱۔ یہ بینگن کس نے بوئے تھے، یہ مولیاں کس نے اُگائی تھیں؟ ——— نام بتاؤ ——— ڈرو نہیں۔

۲۔ سبزی یہاں کیوں اُگائی جاتی ہے۔ وٹامن باہر سے کیوں منگائی جاتی ہے؟

۲۵ر دسمبر ۶۹ء

گنا اور بھیلی

" یہ لمبی لمبی چیز کیا ہے ؟ "
" یہ گنا ہے "
" یہ چپٹی چپٹی چیز کیا ہے ؟ "
" یہ بھیلی ہے "
" بھیلی تو بہت بڑی ہے "
" ہاں بھیلی بڑی ہی ہوتی ہے ۔ کہاوت نہیں سُنی ؟
" گنوار گنا نہ دے ، بھیلی دے "

" سیٹھ جی تم بھی مجُور کو گنا دو "
—— وڈیرا جی ، تم بھی ہاری کو گنا دو "
—— ایک ایک گنا ان کو دو —— سب کو دو "
—— آپ بھی ایک گنا کھاؤ
—— دو کھاؤ ، تین کھاؤ

—— سو گنے مت کھاؤ ، ہزار گنے مت کھاؤ



—— جو زیادہ گنے کھائے گا ۔ شکر کی بیماری پائے گا ۔
سوئیاں لگوائے گا ۔ چلّائے گا، مارا جائے گا"

سوالات

۱۔ ایک بھیلی میں کتنے گنّے ؟

۲۔ کیا تمہیں کبھی کسی گنوار سے واسطہ پڑا ہے ؟

۳۔ کیا تم نے کبھی ہاتھیوں سے گنّے کھائے ہیں؟

۲۵ دسمبر ۱۹۶۹ء

کپڑے والے کے ہاں

"اہاہاہا! کپڑے کی دکان ہے۔ کیسی سجی ہے۔ اوپر سے نیچے تک تھان ہی تھان ہیں۔ دکاندار کسی بی بی کو ساڑھی پہن کر دکھا رہا ہے اور مونچھیں مٹکا رہا ہے۔ اور جتا رہا ہے کہ بی بی جی! یہ ساڑھی لنڈی کوتل کی ہے۔ دو سو روپے میں مفت ہے!

"آیئے بابو جی! کیا لیجئے گا: نین سکھ دوں؟" نہ میاں دکاندار ہم آنکھوں کے اندھے تھوڑا ہی ہیں۔" دل کی پیاس؟ شمونہ، شفون، جارجٹ؟" نہیں میاں نہیں، ہمارا حال پتلا ہے، گاڑھے کے سوا کچھ نہیں پہن سکتے۔

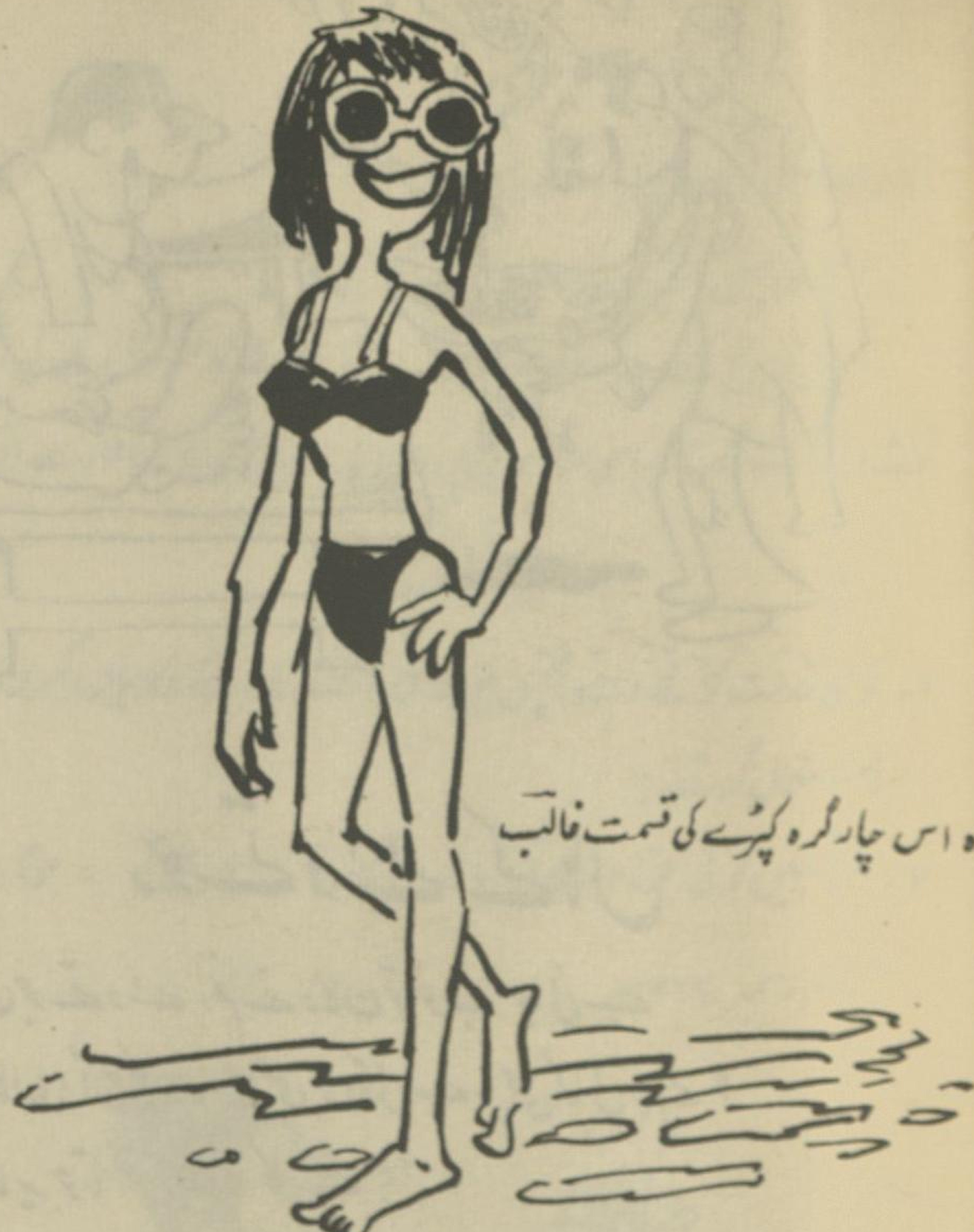
"میاں دکاندار۔ کپڑے کے دام کیوں بڑھا دیتے ہیں؟"

"حضور، آپ کا معیارِ زندگی بلند کر رہا ہوں۔"

"گاہکوں کے کپڑے کیوں اتارتے ہو؟"

"حضور ان کے کپڑے نہ اتاروں تو کپڑے کے نئے مل کہاں سے کھڑے کردوں؟ قوم کی خدمت کیسے کروں؟"

کپڑوں میں کپڑا لنگوٹی۔ چاہے پہنئے۔ چاہے اس میں پھاگ کھیلئے۔ نہ دامن کا ٹنٹا کہ کوئی پکڑ سکے، نہ گریباں کا کھٹکا کہ کوئی چاک کرسکے۔



سوالات

۱۔ غالب کے زمانے میں عاشق کے گریبان میں چار گرہ کپڑا لگتا تھا اب کتنا لگتا ہے۔

۲۔ تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس ۔ یہ لباس امیروں اور غریبوں میں یکساں مقبول کیوں ہے ؟



جوتے والے کے ہاں

" میاں جوتے والے ۔ تم نے دکان تو خوب سجائی ہے "

" جی ہاں ! آج کل ہماری بھی بن آئی ہے ۔ اچھی کمائی ہے "

" بھلا یہ جوتا کس بھاؤ کا ہے ؟ "

" جی یہ بے بھاؤ کا ہے ۔ دُوں ؟ "

" ہاں دے دو ایک جوڑا دس نمبر کا "

" جی آپ کے تو نو نمبر آئے گا ۔ دس نمبر تو میرا ہے "

" ہاں تمہاری باتوں سے تو یہی پتہ چلتا ہے ۔ نو نمبر ہی دے دو "

" دال بھی چاہیئے ؟ "

" وہ کاہے کو ؟ "

" آج کل اس کی بڑی مانگ ہے ۔ جو جوتے لے جاتا ہے ۔ دال بھی لے جاتا ہے

سنا ہے لوگ آپس میں بانٹتے ہیں "۔

"بھئی پہلی تاریخ کے بعد لیں گے "۔

"پہلی تاریخ کے بعد؟ جناب پہلی کے بعد نہ جوتا ملے گا، نہ دال ملے گی۔ آرڈر بک ہیں"۔

نوٹ: انتخابات کے لئے سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندیاں پہلی جنوری ۱۹۷۰ء سے اٹھائی گئیں۔

سوالات

۱۔ قومی خدمت کرنے والے آپس میں دال بانٹنے کے لئے رکابیاں کیوں نہیں استعمال کرتے ؟

۲۔ اگر تمہیں کوئی جوتا دے تو کیا کرو گے ؟ : جوتے کا : جوتا دینے والے کا

۳۰ دسمبر ۱۹۶۹ء



جوتا کھانے کی چیز ہے یا پہننے کی ؟

کھانے کی چیزیں

"بابوجی ۔ پرمٹ دو"
"بابا جا ۔ پیسا لا"
"بابوجی ۔ ٹھیکہ دو"
"بابا جا ۔ ڈالی لا"
"بابوجی ۔ نوکری دو"
"بابا جا ۔ سفارش لا"
"بابوجی ۔ اب ایسا مت بولو ۔ آنکھیں کھولو
پبلک سے ڈرو ۔ خدا کا خوف کرو
جو پیسا کھائے گا ، ڈنڈا کھائے گا
انڈا کھانا چاہیے
ڈنڈا نہیں کھانا چاہیے

سوالات

۱۔ تمھیں کیا چیز کھانا پسند ہے : پیسا ؟ انڈا ؟ ڈنڈا ؟
۲۔ پبلک کیا ہوتی ہے ۔ کبھی دیکھی ہو تو بیان کرو

مکھن

"مکھن کہاں ہے؟"

"مکھن ختم۔ خلاص"

"سارا کھا لیا؟"

"نہیں سارا لگا دیا۔ یہ کھانے کی چیز تھوڑا ہی ہے۔ لگانے کی ہے۔ جس کو لگاؤ پھسل پڑتا ہے"

"جو پھسلے گا اس کی ٹانگ ٹوٹے گی"

"یہ سوچنا اس کا کام ہے۔ ہمارا کام تو لگانا ہے"

سوالات

۱۔ کیا تم نے کبھی کسی کو مکھن لگایا ہے؟ اگر نہیں تو ہمیں لگاؤ۔



کُرسی

یہ کیا ہے ؟ یہ کرسی ہے۔ اس کے کیا فائدے ہیں ؟ اس کے بڑے فائدے ہیں۔ اس پر بیٹھ کر قوم کی بے لوث خدمت بہت اچھی طرح کی جا سکتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ اسی لئے تو جب لوگوں میں قومی خدمت کا جذبہ زور مارتا ہے تو وہ کُرسی کے لئے لڑتے ہیں بلکہ کرسیوں سے لڑتے ہیں۔ ایک دوسرے پر کرسیاں اٹھا کر پھینکتے ہیں۔

کرسی بظاہر لکڑی کی معمولی چیز ہے لیکن لوگوں میں اخلاق حسنہ یعنی عاجزی فروتنی اور خاکساری پیدا کرتی ہے۔ بڑے بڑے پاٹے خاں کرسی کے سامنے آتے ہیں تو خودی کو بلند کرنا بھول جاتے ہیں۔ اُسے جُھک جُھک کر سلام کرتے ہیں، اگر کوئی کرسی پر نہ بیٹھا ہو تب بھی کرتے ہیں۔

اردو میں ایک محاورہ ہے کرسی کا احمق۔خاک نشین لوگ کرسی پر بیٹھنے والوں کو احمق گردانتے ہیں۔ انھیں کرسی کا احمق کہتے ہیں۔ ادھر کرسی والے بغیر کرسی والوں کو احمق جانتے ہیں۔ ہماری رائے میں دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں لیکن بڑا احمق ان میں سے کون ہے؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔

کرسی والے کو کرسی کبھی خالی نہیں چھوڑنی چاہیئے دوسرے لوگ فوراً اس پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کرسی فولڈنگ اچھی ہے' آدمی جہاں جائے اپنے ساتھ لیتا جائے۔

یکم دسمبر ۱۹۷۰ء

چارپائی

یہ چارپائی ہے۔ اس کے چار پائے ہوتے ہیں۔ جن کا خیال ہے کہ تین یا دو ہوتے ہیں وہ غلطی پر ہیں ـــــ انسان چارپائی پر لیٹ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ شروع میں چوپایہ ہی تھا، بعد میں دو پاؤں پر چلنے لگا۔ چارپائی پر لیٹتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اب اپنی اصل جُون میں آیا۔ اس شوق کو بعض لوگ موٹر وغیرہ کی سواری سے بھی پورا کرتے ہیں۔ انسان اور حیوان میں پاؤں کی تعداد ہی کا تو فرق ہے۔ موٹر پر سوار ہونے سے یہ فرق بڑی حد تک مٹ جاتا ہے۔ اسی لئے تو دو پاؤں والے ایسے لوگوں کو دیکھ کر دُور ہی سے بھاگ جاتے ہیں۔

چارپائی بڑے کام کی چیز ہے۔ اس پر لوگ بیٹھتے ہیں، سوتے ہیں، گاتے ہیں، روتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، مرتے ہیں، جیتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ لیٹتے وقت کچھ کتابیں بھی اپنے ساتھ چارپائی پر رکھ لیتے ہیں۔ فارسی میں جو چارپائے بر و کتابے چند کہا جاتا ہے، اس سے ظرف بھی مراد ہوتا ہے، مظروف بھی۔

چارپائی تخت اور کرسی کے مقابلے میں سستی بھی ہے۔ نادر شاہ ہندوستان آیا تو

محمد شاہ کا تخت اٹھا کر لے گیا تھا اور محمد شاہ کو زمین پر بٹھا گیا تھا۔ اگر بادشاہ چارپائی پر بیٹھا ہوتا تو اس کے زمین پر بیٹھنے کی نوبت نہ آتی۔ چارپائی کی مرمت بھی آسان ہے۔ لوگ گلیوں میں آواز لگاتے پھرتے ہیں "چارپائی بنوالو۔ منجی پیڑھی ٹھکوالو" کوئی چارپائی والا ان سے ٹیڑھی بات کرے تو یہ اس کو بھی ٹھوک دیتے ہیں۔ اس کی بھی کان نکال دیتے ہیں۔ سیدھا کر دیتے ہیں۔

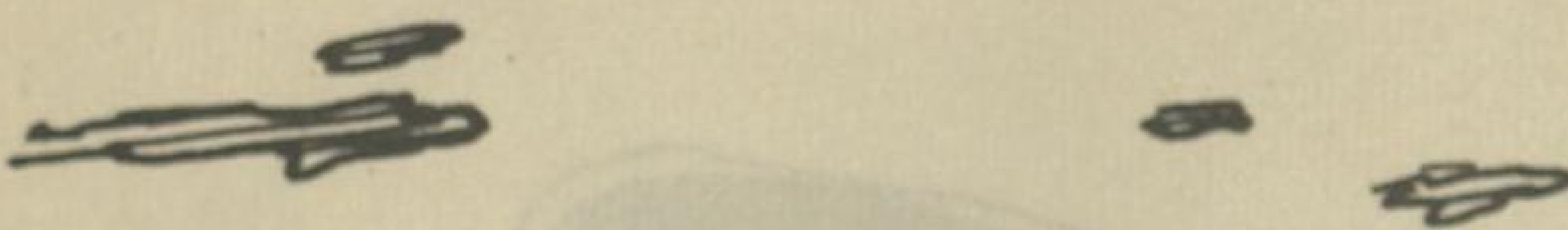
یکم دسمبر ۱۹۷۰ء

ردّی

یہ کونسا اخبار ہے۔
یہ روزنامہ ردّی ہے۔
اس کی نظر میں ساری جماعتیں ردی ہیں۔
سارے نظام ردی ہیں۔
سارے کام ردّی ہیں۔
سوائے ردّی کے کام کے۔

اس کے مضامین بھی بہت ردّی ہوتے ہیں۔ اسی لئے یہ ردّی والوں میں بہت مقبول ہے۔ لوگ منوں کے حساب سے خرید لے جاتے ہیں،
سیروں کے حساب سے بیچتے ہیں۔
یہ سب سے اچھا اخبار ہے۔

اس کا کاغذ مضبوط ہے اور چکنا ہے۔ اس کے لفافے آسانی سے نہیں پھٹتے۔ چاہے ہلدی ڈالو چاہے نمک۔
دوسرے اخباروں میں تو یہ خوبی بھی نہیں۔



چند مناظر قدرت





آسمان

ذرا نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھو، کتنا اونچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اس سے گرے تو بہت چوٹ آتی ہے۔ بعض لوگ آسمان سے گرتے ہیں تو کھجور میں اٹک جاتے ہیں۔ نہ نیچے اُتر سکتے ہیں، نہ دوبارہ آسمان پر چڑھ سکتے ہیں۔ وہیں بیٹھے کھجوریں کھاتے رہتے ہیں۔ لیکن کھجوریں بھی تو کہیں کہیں ہوتی ہیں۔ ہر جگہ نہیں ہوتیں۔

کہتے ہیں پہلے زمانے میں آسمان اتنا اونچا نہیں ہوتا تھا۔ غالبؔ نام کا شاعر جو سو سال پہلے ہوا ہے۔ ایک جگہ کسی سے کہتا ہے۔ ؏ کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟ جوں جوں چیزوں کی قیمتیں اونچی ہوتی گئیں، آسمان ان سے باتیں کرنے کے لئے اوپر اُٹھتا چلا گیا۔ اب نہ چیزوں کی قیمتیں نیچے آئیں نہ آسمان نیچے اُترے۔

ایک زمانے میں آسمان پر صرف فرشتے رہا کرتے تھے۔ پھر ہمہ شما جانے لگے جو خود نہ جا سکتے تھے ان کا دماغ چلا جاتا تھا۔ یہ نیچے زمین پر دماغ کے بغیر ہی کام چلاتے تھے۔ بڑی حد تک اب بھی یہی صورت ہے۔

پیارے بچو! راہ چلتے میں آسمان کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے تاکہ ٹھوکر نہ لگے۔ جو زمین کی طرف دیکھ کر چلتا ہے اس کے ٹھوکر نہیں لگتی۔

ستارے اور ہلال وغیرہ

واہ واہ کیا سہانا منظر ہے. ستارے یہاں سے وہاں تک چھٹکے ہوتے ہیں. ان کی کثرت سے گمان ہوتا ہے جیسے میٹرک کا ریزلٹ شائع ہوا ہو. ادھر ایک ہلال بھی جگمگا رہا ہے. آسمان کی رونق بڑھا رہا ہے.

ستارے چمکتے دمکتے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی ٹوٹ کر گر بھی جاتے ہیں. جب یہ مٹی میں مل جائیں تو کوئی نہیں پوچھتا. وہی ستارے جو دوسروں کی تقدیر کی خبر دیا کرتے ہیں، بلکہ لوگوں کی قسمت بنایا بگاڑا کرتے ہیں. کبھی کبھی خود دوسروں سے اپنی قسمت کا حال بجھواتے جنتریاں کھلواتے نظر آتے ہیں. ہلال کا بھی ایسا احوال ہے. جب تک آسمان پر ہے، بس ہے آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل. ستارے اور ہلال اچھے ہیں لیکن عزت کی غریبانہ زندگی ان سے بہتر ہے.

ہلال یعنی نئے چاند کو پرانے لوگ دور ہی سے دیکھا کرتے تھے اور سلام کیا کرتے تھے، وہ بھی عید بقر عید پر. اس زمانے میں یہ چپ چاپ آپ ہی آپ نکل آتا تھا. پھر ایسا دور آیا کہ لوگوں نے کھدیڑ کر نکالنا شروع کر دیا بلکہ آپس میں لڑتے تھے کہ کون نکالے. چاند کے لئے بڑی مشکل ہوتی تھی کہ سرکار کا کہا مانے یا لوگوں کا. بیشک اتنی بڑی قوم کے لئے ایک دن کی عید کافی نہیں. یکے بعد دیگرے دو تین دن کی ہو لیکن اس میں سر پھٹول بہت تھی. اب یہ سلسلہ بند ہے اور یہ بات ہمیں پسند ہے.



عید کا پیغام لانے کے علاوہ چاند کا کوئی خاص مصرف نہ تھا۔ بس شاعر اور چکور وغیرہ اس سے بات کر لیتے تھے یا پھر اُن بستیوں میں جہاں بجلی نہیں یہ لالٹین کا کام دیتا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا ولایت والوں کو اس کے پیلے رنگ سے خیال ہوا کہ یہ سونے کا بنا ہوا ہے۔ آخر اُڑ کر جا پہنچے اور کالی کالی مٹی کی بوریاں بھر لائے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ ایسی مٹی، بلکہ اس سے اچھی مٹی تو یہاں بھی ڈھیروں ہے بہت پچھتائے۔

آج کل ہمارے ملک میں ہر شے میں خودکفیل ہونے کا رجحان ہے۔ اب لوگ آسمان کے چاند ستاروں کے بھی چنداں محتاج نہیں رہے۔ فلمی ستارے جن کے دم سے زمانے میں اجالا ہے ہمارے ملک میں بنتے ہیں اور اچھے بنتے ہیں۔ بلکہ اب تو دساور کے ملکوں برطانیہ، رُوس، کینیا وغیرہ کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔ چاند بھی دیسی بُرا نہیں ہوتا۔ ہم نے جب چاند کے بارے میں نظموں غزلوں کی پوری کتاب چاندنگر لکھ ڈالی، وہ بھی مقامی ساخت کا تھا۔ مال اس میں اچھا لگا تھا۔ مُدتوں چلا۔

ابر

یہ ابر ہے۔ اب سائنس کا زمانہ ہے، کوئی بچہ بھی بتا دے گا ابر کیا ہوتا ہے۔ مرزا غالب اتنے بڑے شاعر ہو کر لوگوں سے پوچھتے پھرا کرتے تھے کہ ابر کیا چیز ہے۔ ہوا کیا ہے ؟ ہماری ناقص رائے میں مرزا غالب نے سو سال پہلے پیدا ہو کر غلطی کی۔ آج ہوتے تو ابر اور ہوا کا پتہ بھی پاتے —— آدم جی انعام بھی لے جاتے۔

ہوا

یہ ہوا ہے۔ تحقیق نہیں ہو سکا کہ اتنی ہوا کہاں سے آگئی کہ ایک الگ محکمہ آب و ہوا کا بنانا پڑا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کراچی کی بیرونی بستیوں میں جو پانی کے نل ہیں ان میں سے نکلتی ہے۔

ہوا عجیب چیز ہے۔ یہ آگ کو جلاتی ہے۔ چراغ کو بجھاتی ہے۔ جہاز اسی سے چلتے ہیں اسی سے ڈوبتے ہیں۔

لوگوں کی زندگی کا مدار ہوا پر ہے۔ ہوا نہ ملے تو لوگ مر جاتے ہیں۔ ویسے کھانا نہ ملنے سے بھی مر جاتے ہیں لیکن ہوا نہ ملنے سے جلدی مر جاتے ہیں۔ اسی لئے تو کوئی غریب آدمی بڑے آدمی کے پاس کوئی سوال لے کر جاتا ہے تو یہ جواب پاتا ہے کہ جاؤ ہوا کھاؤ۔ بڑے لوگ یہ مشورہ نہ دیتے تو بہت سے غریب کچھ اور کھا کر اب تک مر گئے ہوتے۔

ہوا کے نقصانات بھی ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ بہت اونچا اڑا کر لے جاتی ہے اور پھر پٹخ دیتی ہے۔ بعضوں کے پیٹ میں بھر جاتی ہے۔ بعضوں کے سر میں۔ دونوں صورتوں میں تکلیف ہوتی ہے۔ شخص مذکور کو بھی دوسروں کو بھی۔

ہوا میں وزن بھی ہوتا ہے لیکن بہت کم۔ پرانے لوگ جو اس کی کمند میں پھنس جاتے تھے۔ فارسی میں خدا سے دعا کیا کرتے تھے کہ کریما، ہمارے حال پر بخشش کر۔ اب لوگ نہ فارسی پڑھیں نہ یہ دعا کریں، نہ ان کی بخشش ہو۔

سمندر

یہ سمندر ہے۔ اس میں پانی ہے۔ کراچی کی بستیوں میں تو کے ڈی اے کے اتنے عمدہ انتظامات اور آب رسانی کے منصوبوں کے باوجود پانی کی کمی ہو جاتی ہے۔ سمندر میں کبھی نہیں ہوتی۔ جانے کیا بات ہے؟

سمندر میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ جب یہ چڑھائی کرتا ہے تو کسی کی نہیں مانتا خواہ کوئی کیسا لاٹ صاحب کیوں نہ ہو۔ انگلستان کے ایک بادشاہ کینوٹ کو اس کے مصاحبوں اور درباریوں نے باور کرایا تھا کہ ساری دنیا آپ کے حکم کے تابع ہے آپ کا حکم زمین پر چلتا ہے۔ آسمان پر چلتا ہے۔ تاروں پر چلتا ہے' اخباروں پر چلتا ہے ہوا پر چلتا ہے۔ اور سمندر پر بھی چلتا ہے۔ ایک روز شاہ جلالت مآب سمندر کے کنارے کرسی بچھائے بیٹھے تھے۔ لوگوں سے پوچھا۔ یہ جو لہریں بڑھی آرہی ہیں۔ ہمیں تنگ تو نہ کریں گی؟" مصاحبوں نے کہا: "حضور ان کی کیا مجال ہے۔ الٹا ٹنگوا دیں گے"۔ اس پر بھی لہریں جھپٹ کر آئیں۔ بادشاہ سلامت بہت ناراض ہوئے۔ سختی سے ڈانٹا "اے سمندر! خبردار پرے ہٹ۔ میرے پاؤں بھیگتے ہیں"۔ سمندر نے ایک نہ سنی بادشاہ کو بھگو دیا۔ قریب قریب ڈبو دیا۔

بادشاہ سلامت نے اپنے درباریوں اور مصاحبوں سے جواب طلب کیا کہ وجہ بیان کرو۔ تمہارے خلاف کیوں نہ ضابطہ کی کارروائی کی جائے؟ تمہارا تو بیان



خبردار — پرے ہٹ !

تھا کہ میری سلطنت عام ہے۔ اسے حشر تک دوام ہے اور سمندر تک میرا غلام ہے! لیکن یہ اقدام بعد از وقت تھا۔ اس دوران میں خود بادشاہ سلامت کے خلاف ضابطے کی کارروائی ہو چکی تھی۔ عالم پناہ کو پہلے یہ بات سوچنی چاہیئے تھی۔ اپنے محکمہ اطلاعات پر اتنا بھروسہ نہ کرنا چاہیئے تھا۔

اے پیارے بڑو! سمندر کسی کا غلام نہیں ہوتا۔ چڑھائی پر آتا ہے تو ساحل کی کرسیاں بہائے جاتا ہے اور اگر کوئی ان پر بیٹھا رہنے پر اصرار کرے تو اُسے بھی۔

پہاڑ

ان پہاڑوں کو دیکھو۔ بعضوں کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں کیا باتیں کرتی ہیں؟ یہ کسی نے نہیں سُنا۔

پہاڑوں کے اندر کیا ہوتا ہے؟ معلوم نہیں۔ بعض اوقات پہاڑ کو کھودو تو اندر سے چوہا نکلتا ہے۔ بعض اوقات چوہا بھی نہیں نکلتا۔ جس پہاڑ میں سے چوہا نکلے، اُسے غنیمت جاننا چاہیے۔

جو لوگ پہاڑوں پر رہتے ہیں ان کو گرم کپڑے تو ضرور بنوانے پڑتے ہیں لیکن ویسے کئی فائدے بھی ہیں۔ پہاڑوں پر برف جمتی ہے جو ان لوگوں کو مفت مل جاتی ہے جتنا جی چاہے پانی میں ڈال کر پئیں۔ برف میں رہنے والوں کو ریفریجریٹر بھی نہیں خریدنے پڑتے۔ پیسے بچتے ہیں۔

پہاڑ پتھروں کے بنے ہوتے ہیں۔ پتھر بہت سخت ہوتے ہیں۔ جس طرح محبوبوں کے دل سخت ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کبھی کبھی پتھر موم بھی ہو جاتے ہیں۔

جو پہاڑ بہت سربلندی دکھاتے ہیں ان کو کاٹتے ہیں۔ اور کاٹ کر ان کے پتھر سڑکوں پر بچھاتے ہیں۔ لوگ انھیں جوتوں سے پامال کرتے گزرتے ہیں۔ جو پتھر زیادہ ہی سختی دکھائیں وہ چکی میں پستے ہیں۔ سرمہ بن جاتے ہیں۔ سارا پتھرپن بھول جاتے ہیں۔

چند امتحانی سوالات

۱۔ اگر محمود غزنوی ہندوستان پر سترہ حملے کرے تو احمد شاہ ابدالی کتنے حملے کرے گا ؟

۲۔ بھیم پلاسی کی لڑائی جس میں فریقین نے ایک دوسرے کا دادیسے سے دادرا بجا دیا تھا کس سن میں ہوئی تھی ؟

۳۔ پانی پت کی پہلی لڑائی کہاں ہوئی تھی ؟

۴۔ ہمایوں چھت پر کھڑا کون سے فلمی ستارے دیکھ رہا تھا جن پر پھسل پڑا اور مر گیا ؟

۵۔ تم ان پڑھ رہ کر اکبر بننا پسند کرو گے یا پڑھ لکھ کر اس کا نورتن ؟

۶۔ خاندان مغلیہ میں کبوتروں کی اہمیت پر مضمون لکھو ۔ کاغذ کے صرف دو طرف ۔ تینوں طرف نہیں ۔

۷۔ مثلث کے چاروں ضلعے برابر کیوں نہیں ہوتے؟

۸۔ خطِ نستعلیق خطِ استوا اور خطِ وحدانی کا فرق بتاؤ؟

۹۔ ا۔ بحر ہزج کے کنارے کون کون سے ملک آباد ہیں؟

ب۔ بحر اوقیانوس کی تقطیع کرو۔

۱۰۔ ذیل کے پہاڑوں دریاؤں صحراؤں پر مضمون لکھو۔

کوہِ ندا۔ بحرِ رمل۔ دریائے فصاحت۔ دشتِ جنوں۔ تنگنائے غزل۔